Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1963ء

جشنِ نزولِ قرآن

یا ایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم و شفاء لما فی الصدور۔ و ھدی و رحمۃ للمؤمنین۔ قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذالک فلیفرحوا۔ ھو خیر مما یجمعون۔ (یونس ۵۷-۵۸)

اے نوعِ انسان! تمہاری طرف، تمہارے خدا نے وہ ضابطۂ حیات بھیجا ہے جس میں ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ یہ، ہر اس قوم کی جو اسے اپنا ضابطہ تسلیم کرلیتی ہے، کامیابیوں کی راہ کی طرف راہ نمائی کردیتا ہے، اور انہیں زندگی کی خوشحالیوں سے مالا مال کردیتا ہے۔ ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطہ حیات کا مل جانا، خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو۔

عید الفطر اسی جشن کا نام ہے جو نزولِ قرآن کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون نمبر (۷۵۰۰)	قیمت فی پرچہ	بدل اشتراک
خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور	ہندوپاکستان سے ۷۵ نئے پیسے	ہندوپاکستان سے سالانہ ۸ روپے غیرممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ

نمبر (۳)	مارچ ۱۹۶۳ء	جلد (۱۶)

فہرستِ مضامین

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ کافرگری کے مشغلے ——— صفدر سلیمی ——— ۹

۳۔ مجلسِ اقبالؒ ——— ۲۸

۴۔ قرآن و حدیث ——— علامہ السید احمد الحسینی (ترجمہ سید نصیر شاہ صاحب میانوالی) ——— ۳۷

۵۔ حقائق و عبر ——— ۵۱

۶۔ رابطہ باہمی ——— ۵۳

۷۔ احتساب ——— ۵۶

۸۔ تحویلِ قبلہ ——— ۶۹

۹۔ چہل حدیث ——— (ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی لکھنؤ یونیورسٹی) ——— ۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اراکینِ اسمبلی کی خصوصی توجہ کے لئے

لمعات

پاکستان کے دستور نو کے تحت جس مجلس قوانین ساز (نیشنل اسمبلی) کا وجود عمل آیا ہے اس کا تیسرا اجتماع، شروع مارچ میں ڈھاکہ میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس مجلس کا بنیادی فریضہ ملک کے لئے قوانین مرتب کرنا ہے، لیکن اس نے اپنے پہلے دو اجتماعات میں کوئی جدید قانون مرتب نہیں کیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان ایک عجیب ملک نظر آئے گا جس میں اس کے اپنے آئین کے تحت مجالس قوانین ساز کی رُو سے آج تک کوئی قانون ہی پاس نہیں ہوا۔ تشکیل پاکستان کے بعد آئین سازی کا مرحلہ پیش آیا تو اس میں نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ ۱۹۵۶ء میں خدا خدا کر کے ایک آئین مرتب ہوا، لیکن اس کے تابع ہنوز مجلس قوانین ساز متشکل نہ ہونے پائی تھی کہ وہ آئین ہی کالعدم قرار پا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء کے آئین کے ماتحت موجودہ مجلس قوانین ساز عمل میں آئی تو اس نے ابھی تک کوئی جدید قانون پاس نہیں کیا۔ خدا کرے کہ ڈھاکہ سیشن میں یہ ٹوٹے، اور ملک کے لئے کوئی قانون مرتب ہو سکے۔

یہ صورتِ حال کہ اس مملکت کی مجالسِ قوانین ساز نے آج تک کوئی جدید قانون مرتب نہیں کیا، نظر بظاہر کتنی ہی تاسف انگیز کیوں نہ ہو، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اس ملک کی کچھ خوش قسمتی ہی تھی کہ اس میں کوئی نیا قانون نہیں بنا اس لئے کہ کسی نئے قانون بننے پر ملک کی انتشار پسند قوتوں کی طرف سے جس قسم کے شاخسانے کھڑے کئے جانے کا احتمال ہے، ان کے تصور سے امن و سلامتی کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ آئینِ پاکستان کی رُو سے قانون سازی کی اولین اور لاینفک شرط یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ آئین میں لفظ "اسلام" کی کوئی تعریف (DEFINITION) نہیں دی گئی۔ اس اصطلاح کو غیر متعین چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ملک میں حالت یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کے متعدد فرقے ہیں اور ہر فرقہ کا اسلام الگ الگ ہے۔ اس حد تک الگ کہ کوئی فرقہ ایسا نہیں جسے دوسرے فرقوں نے کافر قرار دے رکھا ہو۔ ابھی پچھلے دنوں، اہل سنت والجماعت کے دو ذیلی فرقوں ـــ دیوبندی اور بریلوی حضرات ـــ نے ملک میں جو خلفشار پیدا کر رکھا تھا وہ سب کے سامنے ہے اور یہ خلفشار کسی نئے عقیدہ یا جدید قانون کا پیدا کردہ نہیں تھا۔ اس کی بنیاد، وہ عقائد تھے جو صدیوں سے متوارث چلے آ رہے ہیں۔

جب قدیم عقائد کے اختلاف کی کیفیت یہ ہے تو کسی نئے قانون کی صورت میں، یہ اختلافات جو شکل اختیار کر سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ مثال کے طور پر ایک نہایت معمولی سے سوال کو لیجیے جو آج کل مغربی پاکستان (بالخصوص لاہور) میں بحث ونظر کا تند و تیز موضوع بن رہا ہے۔ یعنی یہ کہ موسیقی حرام ہے، اسے درگاہوں میں بند کر دینا چاہیئے۔ موسیقی سے مراد ہے ایسا گانا جو سازوں کے ساتھ ہو۔ فرض کیجیے کہ یہی سوال کل کو مجلس قوانین ساز کے سامنے پیش ہو اور وہ قانون پاس کر دے کہ سازوں کے ساتھ گانا حرام، فلہٰذا جرم ہے۔ اب اسی ملک میں کروڑوں کی تعداد میں وہ مسلمان بھی بستے ہیں جو جلیل القدر اولیائے کرام مثل خواجہ معین الدین اجمیریؒ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، بابا فریدؒ شکر گنج (علیہ الرحمۃ) وغیرہ کے والہ شگان دامن ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک سازوں کے ساتھ موسیقی نہ صرف جائز بلکہ جزو عبادت ہے۔ ایسی عبادت کا جزو جس سے یہ حضرات اولیائے کرامؒ روحانیت کے بلند ترین مقام پر فائز تصور کئے جاتے ہیں۔ خود حکومت کے محکمۂ اوقاف نے جن درگاہوں اور خانقاہوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے ان میں بیشتر پر، عرس کے موقع پر، سازوں کے ساتھ موسیقی (قوالی) کا انتظام اس محکمہ کی زیر نگرانی کیا جاتا ہے۔ فرمایئے! کیا یہ کروڑوں مسلمان، اس قسم کے قانون کو (جو موسیقی کو جرم قرار دے دے) کبھی "اسلامی" قانون تسلیم اور اس کی اطاعت کرنے پر آمادہ ہوں گے؟ یا مثلاً، فقہ حنفی کی رو سے، اگر ایک شخص اپنی بیوی سے، ایک ہی سانس میں، تین مرتبہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ کہہ دے تو یہ طلاق بائن ہو جاتی ہے۔ یعنی ایسی طلاق جسے واپس نہیں لیا جا سکتا۔ لیکن اہل حدیث حضرات کے نزدیک یہ طلاق بائن نہیں ہوتی۔ سوچئے کہ اگر کل کو، مجلس قانون ساز ایسا قانون پاس کر دے جو فقہ حنفی کے مطابق ہو تو اہل حدیث حضرات اسے اسلامی تسلیم کر لیں گے؟

یا مثلاً مجلس قانون ساز کے سامنے یہ سوال پیش ہو کہ ملک میں زنا کو قانوناً روک دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ متعین کیا جائے کہ زنا کسے کہتے ہیں۔ جنسی اختلاط کی وہ شکل جسے متعہ کہا جاتا ہے، شیعہ حضرات کے نزدیک بالکل جائز ہے۔ لیکن اہل سنت والجماعت اسے زنا قرار دیتے ہیں۔ سوچئے کہ اگر متعہ کو قانوناً زنا قرار دے دیا گیا تو شیعہ حضرات اس قانون کو اسلامی تسلیم کر لیں گے؟

ہم نے یہ چند مثالیں محض سمجھانے کے لئے پیش کر دی ہیں ورنہ اس قسم کی بے شمار شقیں پیش کی جا سکتی ہیں جو ایک فرقہ کے نزدیک عین مطابق اسلام، اور دوسرے کے نزدیک خلاف اسلام ہیں۔ آپ نے گذشتہ پندرہ سولہ برس میں مذہب پرست طبقہ کی طرف سے مسلسل اور پیہم یہ آوازیں بلند ہوتی سنی ہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ (ہم بھی اس سے متفق ہیں۔ ایسا یقیناً ہونا چاہیئے) لیکن آپ اپنے حافظہ پر زور دے کر سوچئے کہ کیا ان حضرات میں سے کسی نے آج تک یہ بھی بتایا ہے کہ وہ قوانین مرتب کس طرح ہوں گے جو تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی ہوں؟ عمومیت سے آگے بڑھ کر ایک مخصوص مثال کو سامنے لایئے۔ گذشتہ سال سے آپ ایک شور سن رہے ہیں

کہ موجودہ عائلی قوانین خلافِ اسلام ہیں۔ انہیں منسوخ کر دیا جائے۔ یہ شور آپ کو ہر سمت سے سنائی دیا ہوگا۔ لیکن کیا ان حضرات میں سے کسی ایک نے بھی یہ کہا ہے کہ ان قوانین کو منسوخ کر کے ان کی جگہ فلاں ضابطہ قوانین نافذ کیا جائے جو تمام فرقوں کے نزدیک مسلمہ طور پر اسلامی ہے؟ ضابطہ قوانین تو خیر، پھر بھی بعد کی چیز ہے۔ حکومت نے یہ طے کیا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم دی جائے۔ اس کا آغاز ہوا تو مختلف گوشوں سے آوازیں آنی شروع ہوگئیں کہ ہر فرقے کے بچوں کے لئے الگ الگ نصاب تعلیم ہونا چاہیئے۔ سوچیں ملک میں اسلامیات کی تعلیم کا مشترک نصاب قابلِ قبول تصور نہیں کیا جاتا، اس میں مشترکہ ضابطہ قوانین کی ترتیب جس قدر مشکل ہے ظاہر ہے۔

آپ غور کیجئے کہ ان حالات کے پیشِ نظر ایک سوچنے والا انسان، اس کے سوا اور کس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ ایسے قوانین کا بنانا ناممکن ہے جو سب کے نزدیک مسلمہ طور پر اسلامی، فلہٰذا قابلِ قبول ہوں۔ اور اگر اسے تسلیم کیا جائے تو پھر سوچئے کہ (اقبالؒ کی طرف سے پیش کردہ) پاکستان کا تصور (قائدِ اعظمؒ کی طرف سے) پاکستان کا مطالبہ۔ قوم کی طرف سے اس کے حصول کی جدوجہد۔ اس کا قیام۔ استحکام۔ سب دفترِ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ مطالبۂ پاکستان کی وجہِ جواز اور اس کے قیام کی بنیاد یہ تھی کہ ہمیں ایک ایسے آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہے جس میں ہم اسلامی قوانین کا نفاذ کر سکیں۔ اور جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلامی قوانین کی تدوین و ترتیب ہی ناممکن ہے، تو پھر ایک الگ مملکت کے وجود کی وجہِ جواز کیا رہ سکتی ہے؟

یہ تھیں اس مسئلہ کی عملی دشواریاں جنہیں طلوعِ اسلام نے، پاکستان کے یوم تاسیس کے وقت سے ہی اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ طلوعِ اسلام نے جب (تقسیم ہند سے پہلے) تحریکِ پاکستان کی اس قدر شد و مد سے تائید کی تھی تو وہ بھی اندھے جذبات کی رو سے نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی یہ علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسلام کو ایک زندہ حقیقت بننے کے لئے، ایک آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہے اور تشکیلِ پاکستان کے بعد جب اس کے قانون سازی کے سوال کو سامنے رکھا تو اس میں بھی اندھے جذبات کی رو میں نہیں بہہ گیا۔ اس سوال پر اس نے نہایت سکون اور سنجیدگی سے غور کیا۔ ان تمام مشکلات کا جائزہ لیا جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی قرآنی بصیرت نے اسے جس نتیجہ تک پہنچایا اس پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ مسلمان اس وقت جس طرح فرقوں میں بٹ رہے ہیں یہ قریب قریب ویسی ہی شکل ہے جیسی اسلام سے پہلے، عربوں کی حالت تھی۔ اس میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے تھے جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا اور دوسروں کو باطل پر۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ (۲/۱۱۳)

اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرقوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے ایک ہی طریقہ بتایا۔ اور وہ یہ کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ——— تم سب کے سب مل کر اجتماعی طور پر، اللہ کے اس ضابطۂ حیات کو مضبوطی سے تھام لو۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ——— تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جسے اس نے تم پر ارزاں فرمایا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے اپنی عنایت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ (پس) یعنی فرقوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک وحدت بنانے کے لئے، دشمنوں کو بھائیوں میں تبدیل کر دینے کے لئے ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انہیں قرآن پر جمع کرو۔

یہ تھی وہ روشنی جو ہمیں اس باب میں قرآن کریم سے حاصل ہوئی ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی فقہ الگ الگ ہے۔ ان کی احادیث الگ الگ ہیں۔ اور انہی کی بنا پر وہ فرقوں میں بٹ رہے ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے کتاب اللہ۔ لہٰذا ان میں وحدت پیدا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ پاکستان میں قانون کی بنیاد، اللہ کی کتاب، قرآن کریم کو قرار دیا جائے۔ یہ تھا ان مشکلات کا حل جو قانون سازی کے سلسلے میں یہاں قدم قدم پر پیش آنے والی تھیں۔ طلوع اسلام علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچا اور دل کے پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اسے قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ ایسا کرنے میں اسے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن مصائب کو بھگتنا پڑا وہ سب کے سامنے ہیں۔ مخالفت کا ایک سیلاب تھا جو چاروں طرف سے امنڈ پڑا۔ ہر طرف سے سطحی جذبات کی آگ بھڑکا دی گئی۔ اسے منکر حدیث۔ منکر شانِ رسالتؐ۔ منکرِ خدا ملحد۔ زندیق۔ کافر اور نہ جانے کیا کیا قرار دیا گیا۔ اس نے اس تمام ہجوم بلا کو نہایت سکون اور تحمل سے برداشت کیا۔ کسی ضد کی وجہ سے نہیں۔ چونکہ طلوع اسلام نے اپنے سامنے کبھی کوئی ذاتی مفاد نہیں رکھا اس لئے یہاں ضد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے اسے برداشت اس لئے کیا کہ اس کے نزدیک اس کے سوا، قوم کے لئے نجات و سعادت کی کوئی راہ نہ تھی۔ اس لئے، اس دوران میں، اپنے مخالفین سے صرف ایک بات کہی۔ اور وہ یہ کہ جو کچھ طلوع اسلام کہتا ہے اگر وہ غلط ہے ——— یعنی یہ کہ پاکستان میں اسلامی قوانین مرتب کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیا جائے اگر یہ غلط ہے، تو آپ کوئی متبادل صورت ایسی بتا دیجئے جس کے مطابق مرتب کردہ قوانین تمام فرقوں کے نزدیک یکساں طور پر اسلامی قرار پائیں۔ آپ اس پندرہ برس کی پوری تاریخ پر غور کر جائیے۔ کسی طرف سے پیش کردہ کوئی متبادل تجویز آپ کو نہیں ملے گی۔ ہر طرف سے بس ایک آواز آپ کو سنائی دے گی۔ اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں قوانین سازی کی بنیاد "کتاب و سنت" ہونی چاہیئے۔ حالانکہ ایسا کہنے والوں میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ مختلف فرقوں کی "سنت"

الگ الگ ہے اور اس کی بنا پر وہ الگ فرقے بنتے ہیں۔

یہی "کتاب وسنت" کی اصطلاح تھی جو ۱۹۵۶ء کے آئین میں داخل کی گئی تھی۔ اب ۱۹۶۲ء کے آئین میں اس کی جگہ "اسلام" کا لفظ لکھ دیا گیا ہے جس سے وہ مشکل ذرا بھی آسان نہیں ہوئی جس کے رفع کرنے کے لئے یہ حل سوچا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ چونکہ یہ سوال ذرا نازک سا ہے اس لئے اس کا سامنا کرنے کے لئے کچھ ہمت کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ کچھ ایسا دقیق نہیں جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ ہر صاحب ہوش جانتا ہے (یا جان سکتا ہے) کہ یہ کہہ دینے سے کہ "پاکستان میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا" یا کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا" ایسے قوانین مرتب نہیں ہو سکتے جو تمام فرقوں کے مسلمانوں کے نزدیک مسلمہ طور پر اسلامی قرار پائیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حقائق کا سامنا کرنے کی کسی میں ہمت دکھائی نہیں دیتی۔

لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ یہ سوال ایسا نہیں جو اس طرح ٹالے سے ٹل جائے۔ اسے، زود یا بدیر سامنے آنا ہے۔ ملک کے لئے قوانین مرتب کرنے ضروری ہیں اور ان قوانین کا اسلامی ہونا بھی ضروری ہے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ قوانین ایسے ہوں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب قانون کی بنیاد ایسی ہو جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

ہم نے عرصہ ہوا، یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ اگر قانون کی بنیاد "کتاب وسنت" کو قرار دینا ہے تو اس کے لئے، سب سے پہلے، کرنے کا کام یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے علماء حضرات، متحدہ کوشش سے، سنت رسول اللہ کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کر لیں جو قرآن کریم کی طرح، سب کے نزدیک متفق علیہ ہو، اور جس میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہ ہو۔ لیکن اس کے لئے کوئی آمادہ نہ ہوا، اور ہنگامہ آرائیاں بدستور جاری رہیں۔

یہ ہے وہ مقام جس پر ہم روز اول سے اس وقت تک کھڑے ہیں۔ ہم اس کے متعلق بار بار لکھنا اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ سوال، نہ صرف پاکستان بلکہ نفس اسلام کے لئے نہایت اہم اور بنیادی ہے۔ ہمارا دعوے ہے (اور مبنی بر حقیقت دعوے) کہ

(۱) اسلام ہی ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں دنیا کی مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔

(۲) یہ نظام ہر زمانے میں ممکن العمل ہے۔

(۳) ہم نے پاکستان اس لئے حاصل کیا ہے کہ اسلامی نظام کو عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

دُنیا اب انتظار میں ہے کہ دیکھیں وہ نظام کیسا ہے اور اس کے نتائج کیا۔ اب سوچئے کہ اگر ہم اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کی وجہ سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین بھی مرتب نہ کر سکے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے، تو دُنیا ہمارے متعلق جو کچھ بھی سوچے گی، سوچے گی۔ وہ خود اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی! اور اس کے ساتھ یہ بھی سوچئے کہ اس صورت میں ہم اسلام کی عدالت میں کتنے بڑے مجرم قرار پائینگے؟

یہ ہے اس مسئلہ کی وہ اہمیت جو ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ بست و کشاد کی توجہ بار بار اس طرف منعطف کرائیں۔ یاد رکھئے یہ مسئلہ ایسا مشکل اور یہ عقدہ ایسا لاینحل نہیں، جیسا اسے بنا دیا گیا ہے۔ اس کا حل مل سکتا ہے بشرطیکہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں)۔

> ہم اس مسئلہ میں وہی روح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا۔ وہ امت کے اولیں دل و دماغ ہیں جو ہر معاملہ میں آزادیٔ رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضورِ رسالت مآبؐ کی حالتِ نزع میں یہاں تک کہہ دیا کہ حسبنا کتاب اللہ۔ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ (تشکیل جدید۔ ترجمہ نیازی ص ۲۵۰)

باقی رہا یہ اعتراض کہ اگر قانون کی بنیاد تنہا قرآن کریم کو قرار دے دیا جائے تو اس سے سنتِ رسول اللہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے تو یہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ جو قوانین، قرآن کریم کے مطابق ہوں وہ سنتِ صحیحہ کے خلاف ہو سکتے ہیں۔ قرآن کو قانون کی بنیاد قرار دیجئے تو اس میں سنتِ صحیحہ کا اتباع خود بخود آ جاتا ہے۔ لیکن اگر سنت کے ان مجموعوں کو قانون کی بنیاد قرار دیجئے جو اس وقت مختلف فرقوں کے ہاں مختلف ہیں تو اس سے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ قرآن کو معیار قرار دیجئے تو تمام مشکلات کا حل مل جاتا ہے۔

کیا ہم توقع کر سکتے ہیں کہ ملک کا ذمہ دار، سنجیدہ طبقہ، ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریگا۔!

★ ادارکین ادارہ کی طرف سے احباب کی خدمت میں ہدیۂ عید مبارک ★

کراچی کے دوستو!
آیئے اور ہر اتوار کی صبح ۹ بجے سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکرِ قرآن پرویز صاحب کی زبان میں سنئے کہ قرآن عصرِ حاضر کے چیلنج کا علی وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے اور زندگی کے درپیش مسائل کا کس قدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔

طلوعِ اسلام کنونشن

۲۹ — ۳۰ — ۳۱ — مارچ ۶۳ء

کو لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ بزموں کو ہدایات الگ بھیجی جا رہی ہیں۔ ——— ★ (ادارہ)

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن ہر اتوار کی صبح کو (بوقت ۹ بجے) ۲۵۔بی۔ گلبرگ میں باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ (نمائندہ بزم لاہور)

راولپنڈی میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن ہر جمعہ کی شام کو ۴ بجے بمقام الکوثر بلڈنگ (بالمقابل گورنمنٹ گرلز کالج مری روڈ) پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔ (نمائندہ بزم طلوعِ اسلام)

جہلم میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو بوقت ۵ بجے شام ڈاکٹر حقیق مرزا صاحب کے دولتکدہ پر بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔

پرویز صاحب کے بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ **فردوسِ گم گشتہ** دوسری بار طبع ہو کر منظرِ اشاعت پر آگیا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ **میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ** ۲۵۔بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

(تفصیل ٹائیٹل کے صفحہ ۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔)

صفدر سلیمی ——— *

کافرگری کے مشغلے

اے مسلمان! اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم
(اقبالؒ)

اسلام، مروّجہ مذاہب عالم کی طرح، ایک مذہب نہیں بلکہ نام ہے خدا کے اس عطا فرمودہ دین کا جو عالمگیر انسانیت کے قیام کا مقصود و منتہا لے کر انسانی معاشرہ میں کار فرما ہوتا ہے۔ اس منشائے خداوندی کی تکمیل کے لئے وہ زندگی کو مستقل قدریں اور بنیادی اصول عطا کرتا ہے اور ایسے نظام کی تشکیل عمل میں لاتا ہے جو خالص قوانین خداوندی کی اطاعت پر استوار ہوتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں کاروان انسانیت کو ہر نوع غلامی سے نجات حاصل ہوتی ہے اور سلطانی و مُلّائی و پیری کے لات و منات پیوند زمین ہو کر رہ جاتے ہیں۔

چودہ سو سال قبل، حضور نبی اکرمؐ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے مقدس ہاتھوں عرب کے ریگ زاروں میں اسی نظام خداوندی کی روح نواز اور دلکشا بساط بچھی تھی۔ اور دین کا یہی وہ نظام تھا جس کی کار فرمائی کی ذمہ داریاں امت مسلمہ سے وابستہ تھیں۔ اسی نظام کی برکتوں اور سعادتوں سے روئے زمین کا ہر گوشہ منور کرنے کے لئے انہوں نے شہادت گہ الفت میں قدم رکھا تھا اور جب تک خدا کا یہ مقدس دین اپنی حقیقی شکل میں کار فرما رہا، وحدت و اخوت کی بہار چاروں طرف چھائی رہی۔ اتحاد و ائتلاف کے پھول ہر سمت مسکراتے رہے۔ ربط باہمی کی موج سلسبیل دلوں میں دوڑتی رہی۔ پوری اُمت بُنیانٌ مرصوص کی طرح جذب و محبت کے سانچے میں ڈھلی رہی۔ ایک فرد کی مصیبت پوری امت کی مصیبت اور ایک کا غم سب کا غم تھا۔

وحدتِ اُمت کا نقشہ

دین خداوندی کے اس محکم نظام میں فساد اختلافات کی گنجائش نہ تھی۔ افتراق و انتشار کا کوئی تصور تک ذہنوں میں نہیں اُبھر سکتا تھا۔ فرقہ بندی کا ادنیٰ رجحان قابل قبول نہیں تھا۔ سب مسائل حیات اور امور مملکت، مستقل اقدار کی حدود میں، باہمی مشاورت سے طے پاتے تھے۔ اس میں نہ مذہبی اجارہ داروں کا کوئی

الگ گروہ موجود تھا۔ نہ پیشوائیت کی کوئی مخصوص گدیاں قائم تھیں، نہ فتوے بازی کی دکانیں۔ سجانے کا تقاضا پیدا ہوا اور نہ کافرگری کی مسندیں بچھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دینِ خداوندی کا ایک مستقل اور جیتا جاگتا مرکز موجود تھا۔ اسی کی اتھارٹی سے دین کے فیصلے نافذ ہوتے تھے اور اس خلافت علیٰ منہاج نبوت اور اس کے مقرر کردہ نائبین کے ہاتھوں مملکت کا ہر معاملہ حسن وخوبی سے طے پاتا تھا۔ انفرادی لحاظ سے کسی فرد کے فیصلوں کو کوئی قانونی درجہ حاصل تھا اور نہ اس لحاظ سے کسی کی ذاتی اتھارٹی تسلیم کی جاتی تھی۔ یہ تھا وحدت و اخوت، اتحاد و ائتلاف اور جذب باہمی کا وہ نظام جس کی دلکشائیاں اور عالم آرائیوں کی طرف نوعِ انسانی پروانوں کی طرح کھچی چلی آ رہی تھی اور اس کی کشت نوبہار میں ہر طرف جنت کی شادابیوں کا سماں بندھ رہا تھا۔ جب تک خدا کے اس دین کا سکہ رواں رہا ہر قسم کی فرقہ بندی بدترین شرک کے مترادف اور بڑی سے بڑی تعزیر کی سزاوار قرار پاتی رہی۔ اہل ایمان کی صفوں میں کوئی فساد، کوئی انتشار اور کوئی تفرقہ راہ نہ پاسکا۔ محمود و ایاز شانہ بشانہ بارگاہِ اطاعت میں سر جھکاتے رہے۔ عبد و مولا اور حاکم و محکوم کے امتیازات کا کوئی تصور قلب و نگاہ میں نہ ابھر سکا۔

بدنصیبی کا مرحلہ

لیکن جب دین کی یہ اساس قائم نہ رہی اور خلافت علیٰ منہاج نبوت، ملوکیت میں تبدیل ہوگئی تو خدا کا دین، دیگر مذاہب کی طرح، ایک مذہب کی سی حیثیت اختیار کر گیا۔ تاریخِ دین کا یہی وہ دلدوز المیہ اور خونچکاں حادثہ تھا جس سے امت اپنا حقیقی مقام و منصب کھو بیٹھی اور نظامِ زندگی کا سارا کھیل بگڑ گیا۔

اب سیاسی معاملات کی باگ ڈور حکمرانوں کے ہاتھ میں تھی جو استبداد کی راہوں پر نشۂ اقتدار میں سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ اور امورِ شریعت کی سرانجام دہی کے لئے مذہبی پیشوائیت کی جداگانہ مسندیں قائم کر دی گئیں۔ مذہب و سیاست کی یہ ثنویت خدا کے دین میں اس شرکِ عظیم کا ارتکاب تھا جس کے تخریبی نتائج اس سے قبل عیسائیت اور یہودیت اور دیگر ادیان کی تاریخ میں اپنے خرابے بکھیر چکے تھے۔ اور جب مسلمانوں نے بگڑ کر اختیار کی تو امت پر ایک مستقل عذاب مسلط ہوگیا اور اس کے بعد پھر آج تک اس کی نشاۃ ثانیہ اور بازآفرینی کی صبح بہار طلوع نہ ہو سکی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی گاڑی پٹڑی سے اتر گئی اور دین کا ہر گوشہ نت نئے خرابوں کی زد میں آ گیا۔ سیاست نے دین سے جدا ہو کر چنگیزی مزاج اختیار کر لیا۔ اور دوسری طرف اس کے "ظل سبحانی" بن کر ابھرتی ہوئی پیشوائیت نے امورِ شریعت پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے روز افزوں فتنہ و فساد کے دروازے امت پر کھول دئیے۔ فرقہ بندی کے مشرکانہ رجحان نے بیسیوں فرقوں کی داغ بیل ڈال دی۔ ان فرقوں کی باہمی جنگ و جدل اور سر پھٹول، ایک دوسرے کے خلاف کفر بازی کے فساد انگیز مشغلے، عقائد و نظریات اور مقاصد تک میں متعصبانہ ٹکراؤ، باہمی مناظروں کی بے ہودہ چپقلش — یہ تھے وہ انوکھے انعامات جو ملوکیت اور پیشوائیت کی اس ہمہ گیر کارفرمائی سے بیچاری امت کو ملے اور اس کے نتیجہ میں زندگی کی وہ مستقل قدریں، جو دینِ خداوندی کے ایوانِ عظمت کی اساس تھیں، زیر و زبر ہو کر رہ گئیں۔ قرآن پکارتا رہا کہ دین میں فرقہ بندی شرک ہے لیکن

مذہب اور اس کی شریعت کے اجارہ دار بے محابا اپنی تفرقہ انگیز پیشوائیت کی دکانیں سجاتے چلے گئے۔

کافرگری کے معرکے

اختلافات عقائد کی بنا پر ایک دوسرے فرقے یا ایک دوسرے مسلمان افراد کے خلاف کفر کے فتوے، اس نئی صورت حال کا جو امت میں پیدا ہوئی لازمی نتیجہ تھے اور یہ فتنہ عظیم صدیوں سے اُمت کے خرمن اتحاد کو منافرت کے شعلوں کے سپرد کئے چلا آ رہا ہے۔ ابتدائی دور کے مختلف فرقوں کی باہمی خون آشام لڑائیاں صدیوں قبل کی دلخراش روئیداد ہیں۔ ہم ان داستانوں کو رنج و غم سے پڑھتے ہیں اور ان پر خون کے آنسو بھی بہاتے ہیں لیکن بہت کم سوچتے ہیں کہ آج تک ہماری تاریخ کا کون سا دور ان اشتعال انگیز لڑائیوں سے محفوظ رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ گیارہ بارہ صدیوں سے ہمیں کبھی ان آویزشوں سے فراغت نصیب نہیں ہوئی۔ ؏

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

ہمارے اپنے دور میں

دور کیوں جایئے، ابھی ابھی ہمارے اپنے ہاں کیا کچھ ہوتا رہا! بریلوی۔ دیوبندی اور اہلحدیث فرقوں کا باہمی الجھاؤ اور ٹکراؤ کسے یاد نہیں۔ مہینوں دھما چوکڑی مچی رہی کہ خدا کی پناہ۔ ایک دوسرے فرقے کے خلاف شرمناک گالی گلوچ ایک دوسرے کے بزرگوں کی تحریروں کی بنا پر کفر کے فتوے، مناظرہ بازی کے اشتعال انگیز چیلنج، منافرت انگیز لٹریچر، جگر پاش پوسٹر بازیاں، جلسوں اور جلوسوں کے ہنگامے۔ ایک دوسرے کے اجتماعات میں اخلاق سوز ہلڑ بازیاں۔ ایک دوسرے کے زعمائے کرام پر قاتلانہ یورشیں، زبان و قلم کی زہر بھری شورشیں، ایک دوسرے کے خلاف نئے نئے "اسلامی" جرائد کا اجراء۔ دن رات پوسٹروں اور پمفلٹوں کی دلآزار اشاعت، گالی گلوچ کے ماہروں کو "مجاہد اسلام" اور "فخر اسلام" کے خطابات، مسجدوں کی مورچہ بندی سے ایک دوسرے پر سنگباری الغرض گذشتہ چند ماہ میں یہاں آنکھوں نے خدا، رسول، اسلام، ایمان اور توحید کے نام پر کیا کچھ ہوتے نہیں دیکھا۔ اور یہ سب جنگجو مجاہد ایک خدا، ایک رسول، ایک کعبہ، ایک اسلام کے ماننے والے بلکہ "جاں باختہ عاشق" تھے اور اسی عشق کی مستی میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ غیظ و غضب کی تند و تیز آندھیاں چلتی رہیں۔ فضا میں چاروں طرف انگارے برستے رہے۔

معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ باقاعدہ سرفروش مجاہدوں کی بھرتی شروع ہوئی۔ ایک دوسرے کی صفیں الٹنے کے لئے حلف اٹھائے گئے۔ ایک دوسرے کو خاک و خون میں تڑپانے کے لئے خونی معاہدے پُر کئے گئے۔ (اور ابھی تک پُر کئے جا رہے ہیں) بڑی باقاعدگی سے ان سرفروشوں کی فہرستیں شائع ہوتی رہیں (اور ابھی تک ہو رہی ہیں) اور پھر جانبازی اور سرفروشی کی ان قاہرانہ قوتوں کا حسن انداز دیکھئے کہ ایک فوج کی تنظیم "حزب اللہ" کے نام سے ہوئی اور دوسری کی "حزب الرسول" کے نام سے یعنی ایک طرف "خدا کا لشکر" اور دوسری طرف اس کے مقابلے میں (معاذ اللہ، معاذ اللہ) "رسول کا لشکر"۔ ذرا جگر تھام کر سوچئے کہ ایک دوسرے فرقے کے خلاف خدا اور رسولؐ کے مقدس ناموں سے یہ دولشکر قائم کرنے والے کون تھے؟ کیا "خدا اور رسولؐ"

کے لشکروں "کو (معاذ اللہ) آپس میں ٹکرانے کا یہ تصور ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ایسے شخص کے دل میں اُبھر سکتا ہے جو اپنے دل میں خدا کا ذرہ بھر خوف اور اس کے رسولؐ کی محبت کا شمہ بھی اپنے قلب کی گہرائیوں میں رکھتا ہو؟ لیکن صد حیف کہ یہ سب کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہوا اور ـــــ وائے بہ حالِ ما ـــــ کہ یہ سب کچھ خدا کی توحید اور رسولؐ کی محبت کے بلند بانگ دعووں اور تکبیر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ ہوا۔ اس لئے ہوا کہ ان میں عقیدہ کا کچھ باہمی اختلاف تھا۔ اس لئے ہوا کہ یہ الگ الگ فرقوں سے تعلق رکھتے تھے اور جو قائدین انہیں لڑا رہے تھے وہ ان کے اپنے اپنے فرقوں کے مقتدر پیشوا تھے۔ اور دوسرے فرقوں کے نزدیک کافروں سے بدتر۔ اپنے اپنے ہم عقیدہ عوام کے لئے ان کا ایک ایک لفظ خدا اور رسول کے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اور ان کے ادنیٰ اشارے پر (اپنے خونی معاہدوں کے مطابق) سر دھڑ کی بازی لگانے اور مخالفین کو خاک و خون میں تڑپانے میں کسی تاخیر کے روادار نہ تھے ـــــ کیا یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی یہ جاننے کا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خدا کا دین کہاں سے کہاں پہنچ گیا؟ امت کی کشتی کیوں اس بھنور میں پھنس رہی ہے اور اسلام کو کفر سے بھی بدتر مقام تک پہنچانے کے حقیقی مجرم کون ہیں؟

حقیقت حال کی یہ پکار صاف سنائی دے رہی ہے کہ فرقہ بندی کا یہی شرک اور مذہبی اجارہ داری کی خودسری ہی دینِ خدا کی اس بے آبروئی کے سرچشمے ہیں۔ دوسرے فرقوں کو کافر اور اپنے کو مومن سمجھنے کی اس خودسری نے امت کی کشتی کو طوفانِ بلا کے سپرد کر رکھا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی یہی مفاد پرستیاں ہی تو ہیں جنہوں نے اسلام کی عزت و ناموس کو رسوائیوں سے دوچار کیا ہے۔ فتنہ و فساد کا یہ گھناؤنا غار ـ جس میں اب ایک قدم بھی اطمینان اور سلامتی سے نہیں اٹھ سکتا ـ پیداوار ہے اس زہریلے بیج کی جو کفر کے فتووں کی صورت میں بویا گیا۔ عام مسلمانوں کو تو چھوڑیئے، ان فتووں کی رُو سے تو ملت کی وہ عظیم و جلیل شخصیتیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں جن کی عرق ریزیوں اور جگر کاویوں سے امت کو حیاتِ نو نصیب ہوتی رہی اور جن کی زندگی کا ایک ایک سانس دین کی خدمت اور ملت کی بازآفرینی کے لئے وقف رہا۔ اس صورت حال کا جس قدر ماتم بھی کیا جائے کم ہے ؎

خدا عدو کو بھی یہ روزِ بد نہ دکھلائے

کافرگری کی ایک انوکھی داستان

ایک اچھے بھلے اسلام کے مدعی کے خلاف کفر کا فتویٰ کیسے صادر ہوتا ہے؟ اس کے کفر و ایمان کے جانچنے کے لئے کن امور کو وجہ جواز بنایا جاتا ہے؟ ان نازک فیصلوں میں کون سے شواہد سامنے رکھے جاتے ہیں اور اس کے لئے کس قدر تحقیق سے کام لیا جاتا ہے ـــ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ کچھ عرصہ ہوا ایک ستم ظریف نے مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی کتاب "تصفیۃ العقائد" سے کچھ سطور نقل کیں اور یہ بتائے بغیر کہ یہ اقتباسات کہاں سے لئے گئے ہیں، دارالعلوم دیوبند ہی کے دارالافتاء کو بھیج کر شرعی فیصلہ طلب کیا۔ دارالافتاء کے مفتیانِ کرام نے بلا کسی ادنیٰ تحقیق کے کہ ان سطور کا راقم کون ہے اور یہ کہاں سے نقل کی گئی ہیں، جو فتویٰ صادر فرمایا وہ بالفاظ حسب ذیل ہے۔

فتوی ۱۲ - الجواب :

انبیاء علیہم السلام معاصی سے معصوم ہیں ان کو مرتکب معاصی سمجھنا (العیاذ باللہ) اہل سنت والجماعت کا عقیدہ نہیں۔ اس کی وہ تحریر خطرناک بھی ہے اور عام مسلمانوں کو ایسی تحریرات کا پڑھنا جائز بھی نہیں۔

فقط۔ واللہ اعلم - سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند۔

جواب صحیح ہے۔ ایسے عقیدے والا کافر ہے۔ جب تک وہ تجدید ایمان اور تجدید نکاح نہ کرے اس سے قطع تعلق کریں۔ (دستخط) مسعود احمد عفا اللہ عنہ

مہر دارالافتاء دیوبند فی الہند

(اختلافات عقیدہ و مسلک کی حقیقت صفحہ ۱۲ از عامر عثمانی

بحوالہ سہ روزہ "دعوت" دہلی بابت ۱۱ جنوری ۱۹۵۶ء)

فتویٰ صادر کئے جانے کے بعد جب حقیقت سے پردہ اٹھا اور معلوم ہوا کہ جس تحریر پر کفر کا یہ فتویٰ صادر کیا گیا ہے وہ تو خود حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کی ہے تو مذہب و شخصیت کے پرستاروں میں ہیجان و اضطراب کی ایک قیامت سی برپا ہو گئی۔ اسی دارالعلوم کے سند یافتہ ہزاروں کی تعداد میں امام، خطیب، مفتی اور معلم بن کر برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسی دارالعلوم کے تقدس مآب بانی کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر ہو رہا تھا اور سب سے بڑی قیامت یہ کہ یہ فتوے دینے والے کسی دوسرے فرقے کے مفتی نہیں تھے جنہوں نے جذبۂ مخالفت سے ایسا کیا بلکہ یہ حضرات خود دیوبند ہی کے دارالافتاء کے مسند نشین اور مفتی تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگی میں شاید کسی ایک کافر کو مسلمان نہ کیا ہو لیکن آئے دن دعوت ایمانی کے پیروؤں کو دائرہ ایمان سے خارج قرار دینا ان کا مقدس پیشہ بن چکا تھا --- وہ اسے خدمت دین سمجھ کر بصد فخر سرانجام دے رہے تھے --- اور اب فتویٰ تکفیر کی ان کے نوک قلم کی زد اپنے ہی مکتبۂ فکر کے واجب الاحترام بانی پر پڑ رہی تھی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ برصغیر کی سب سے بڑی درسگاہ کی عزت و ناموس خود وہیں کے فتوے بازوں کے قلم کی نوک سے چھلنی چھلنی ہو کر رہ گئی۔ دیوبند کا سارا وقار داغدار ہو گیا۔ اور اس داغ کو دھونے کے لئے جو کچھ کرنا پڑا اس کی تفصیل بڑی طویل ہے اس کا ایک گوشہ وہیں کے ماہنامہ تجلی کے مدیر محترم عامر عثمانی صاحب کے قلم سے سامنے آتا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

سنا گیا ہے کہ فخر الاماثل محترم و معظم جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس فتوے سے متعلق کوئی بہت طول توضیحی مضمون اشاعت کے لئے اخبارات کو بھیجا ہے۔ یہ ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ بے شک مذکورہ فتوے سے حضرت العلامہ مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے دامن پر جو سیاہی

حد درجہ افسوسناک طور پر ڈالی گئی ہے۔ اس کو دھونا صرف حضرت موصوف کا فرض ہے بلکہ ہر اس شخص کا فرض ہے جو حضرت مولانا قاسمؒ کی فضیلت و عظمت سے باخبر ہوا ور جو بدنامی اس فتوے سے دارالعلوم جیسے معزز ادارے کی ہوئی ہے اس کی مناسب تلافی کے لئے حضرت مہتمم صاحب سے زیادہ موزوں اور مناسب اور کون ہو سکتا ہے۔

(اختلافات عقیدہ و مسلک کی حقیقت ص۹ از عامر عثمانی)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

لیکن یہ چیز فی الحقیقت خلاف نہیں کرے گی کیونکہ حضرت مولانا قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا خاکم بدہن کافر و گمراہ ہونا تو کجا معمولی غلط نویس ہونا بھی نہ تو اس شخص کے نزدیک درست ہے جس نے اپنے مضمون میں مذکورہ فتوے کو نقل کیا ہے۔ نہ ہم ایک منٹ کے لئے بھی یہ تصور کر سکتے ہیں کہ حضرت مولانا قاسم رحمتہ اللہ علیہ کے قلم سے ایسی بات نکل سکتی ہے جو قرآن و سنت کے سراسر خلاف ہو مضمون نگار کا اور ہمارا بالیقین یہی خیال اور فیصلہ ہے کہ غلطی فتوے دینے والوں کی ہے۔ اور غلطی کے پیچھے بے علمی نہیں، عصبیت کارفرما ہے۔ تب مولانا قاسم صاحبؒ کی عبارت کی توثیق و تصویب تحصیل حاصل سے زیادہ کچھ نہیں۔ بلکہ اس سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ ثابت و صادق ہو جائے گی کہ زاویۂ نگاہ اگر صالح نہ ہو تو صحیح سے صحیح تر چیز بھی غلط سے غلط تر نظر آ سکتی ہے۔ نیز یہی مفتی ہیں جن کے قلم سے مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں مخالفانہ فتووں کا صدور ہوتا رہا ہے۔　　(ایضاً۔ ص۱۰-۱۱)

یعنی ایک صاحب کے نزدیک حضرت نانوتویؒ کا معمولی غلط نویس ہونا بھی ممکنات سے نہیں۔ اور دوسرے صاحب کے نزدیک وہ (معاذ اللہ) کافر ہیں۔ اقبالؒ نے کس قدر درست کہا تھا کہ

شیخِ ملت با حدیثِ دلنشیں　　　بر مرادِ او کند تعمیرِ دیں

ایک تازہ ترین مثال

اسی نوعیت کی ایک تازہ ترین مثال اس فتوے کی ہے جو پچھلے دنوں قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خلاف شائع ہوا اور قارئین یہ سنکر مزید حیران ہوں گے کہ یہ فتویٰ بھی مفتی دارالعلوم دیوبند سید مہدی حسن صاحب کے قلم سے صادر ہوا۔ یا للعجب! دیوبند کی دو چوٹی کی شخصیتوں کے خلاف فتوے صادر ہوئے اور خود ان کے اپنے دارالافتاء سے ہوئے۔ مولانا نانوتویؒ اور قاری صاحب کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان کے اپنے دارالافتاء سے بھی ان پر کفر کے فتوے عائد ہوں گے۔ یہ داستان بھی بڑی عجیب و غریب ہے اور بڑی عبرت انگیز بھی۔ لاہور کے سہ روزہ

"ایشیا" نے اسے "دعوت" دہلی کے حوالے سے ۹ جنوری کی اشاعت میں بجنسہٖ شائع کیا ہے۔ آپ بھی سنئے۔ سب سے پہلے شرعی فیصلہ طلب کرنے والے کا استفتاء ملاحظہ ہو۔

> کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ اگر کوئی عالمِ دین فَاَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا ○ کی تشریح اور اس سے درج ذیل نتائج اخذ کرتے ہوئے اس طرح لکھے
>
> اقتباس نمبر ۱: "یہ دعویٰ تخییل یا وجدانِ محض کی حد سے گزر کر ایک شرعی دعویٰ کی حیثیت میں آجاتا ہے کہ مریم عذراء کے سامنے جس شبیہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھونک ماری وہ شبیہ محمدی تھی۔ اس ثابت شدہ دعویٰ سے بین طریق پر خود بخود کھل جاتا ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہ مبارک کے سامنے بمنزلہ زوجہ کے تھیں۔ جب کہ اس کے تصرف سے حاملہ ہوئیں۔"
>
> اقتباس نمبر ۲: "پس حضرت مسیحؑ کی ابنیت کے دعویدار ایک حد تک ہم بھی ہیں مگر ابن اللہ مان کر نہیں بلکہ ابن احمد کہہ کر خواہ وہ ابنیت تمثالی ہی ہو۔"
>
> اقتباس نمبر ۳: "حضورؐ تو بنی اسمٰعیل میں پیدا ہو کر کل انبیاء کے خاتم قرار پائے اور عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں پیدا ہو کر اسرائیلی انبیاء کے خاتم کئے گئے۔ جس سے ختم نبوت کے منصب میں ایک گونہ مشابہت پیدا ہو گئی۔ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ"۔
>
> اقتباس نمبر ۴: "بہرحال اگر خاتمیت میں حضرت مسیحؑ کو حضورؐ سے کامل مناسبت دی گئی تھی تو اخلاقِ خاتمیت اور مقاماتِ خاتمیت میں بھی مخصوص مشابہت و مناسبت دی گئی جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی بارگاہ محمدی سے خلقاً و خُلقاً و نسبًا و مقامًا ایسی ہی مناسبت ہے جیسی کہ ایک چیز کے دو شریکوں میں یا باپ و بیٹوں میں ہونی چاہیئے۔"

براہ کرم مندرجہ بالا اقتباسات کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اس کی صحت و عدم صحت کو ظاہر کر کے بتائیں کہ ایسا شرعی دعویٰ کرنے والا اہل سنت والجماعت کے نزدیک کیا ہے؟ المستفتی۔

("ایشیا" لاہور بابت ۹ جنوری۔ بحوالہ "دعوت" دہلی بابت ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲ء)

یہ استفتاء آپ نے پڑھ لیا اب مفتی دارالعلوم دیوبند کا اس سلسلے میں فتویٰ پڑھیئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

الجواب:۔ جو اقتباسات سوال میں نقل کئے گئے ہیں۔ اس کا قائل قرآن عزیز کی آیات میں تحریف کر رہا ہے بلکہ درپردہ قرآنی آیات کی تکذیب اور ان کا انکار کرتا ہے۔ جملہ مفسرین نے تفاسیر میں تصریح کی کہ وہ جبرئیل علیہ السلام تھے۔ جو مریم علیہا السلام کی طرف بھیجے گئے تھے وہ شبیہ محمدی نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے کبھی یہ سمجھا بلکہ "ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون کلمۃ القاھا الی مریم و روح منہ" "رب انی یکون لی غلام" "لاھب لک غلاما زکیا" "قال ربک ھو علی ھین و لنجعلہ آیۃ للناس الی آخر الآیات" "ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" کے قائل تھے۔ اور اس پر اجماع امت ہے کہ وہ فرشتہ تھا جو حضرت مریمؑ کو خوش خبری سنانے آیا تھا۔ شخص مذکور ملحد و بے دین ہے۔ عیسائیت و قادیانیت کی روح اس کے جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ وہ اس ضمن میں عیسائیت کے عقیدے عیسیٰ ابن اللہ کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے۔ جس کی تردید علی رؤس الاشہاد قرآن عزیز نے کی ہے۔ نیز "لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسیٰ بن مریم الحدیث" بیانگ دہل شخص مذکور کی تردید کرتی ہے۔ الحاصل یہ اقتباسات قرآن و احادیث اور جملہ مفسرینؒ اور اجماع امت کے خلاف ہیں۔ مسلمانوں کو ہرگز اس طرف کان نہ لگانا چاہیئے۔ بلکہ ایسے عقیدے والے کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے جب تک توبہ نہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند

(ایضاً)

واضح رہے کہ مستفتی صاحب نے مذکورہ اقتباسات قاری محمد طیب صاحب کی ایک تازہ تصنیف "اسلام اور مغربی تہذیب" سے نقل کئے تھے اور انہی اقتباسات کی بنا پر مفتی مہدی حسن صاحب نے یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ ایسا شخص ملحد و بے دین ہے۔ اور جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے۔ یہ سب کچھ شائع کرنے کے بعد معاصر دعوت دہلی "شکایت ہے ہمیں" کے عنوان سے لکھتا ہے۔

شکایت ہے ہمیں

اس فتوے کے سلسلہ میں ہمیں پہلی شکایت تو مستفتی سے ہے انہیں جب ہمارے مفتیان کرام کی اس کمزوری کا علم ہے کہ وہ حوالوں سے بے نیاز ہو کر فتویٰ دینا جانتے ہیں تو انہیں اس کمزوری کا مذاق نہیں اڑانا چاہیئے۔ کیونکہ بہرحال اس کا اثر اور نقصان اس منصب کو پہنچتا ہے جس پر اصحاب فتویٰ فائز ہیں۔ دوسری شکایت مولانا طیب صاحب سے ہے کہ اس طرح کے تفلسف اور نکتہ آفرینی سے دین کی کوئی خدمت

نہیں ہوتی بلکہ کچھ صدمہ ہی پہنچا ہے۔ مگر اصل شکایت حضرت مفتی سے ہے۔ ہندوستان کی پچھلی ۴۰۔۵۰ سال کی تاریخ فتاویٰ میں بارہا ایسی باتیں سامنے آتی رہی ہیں کہ لوگ کچھ عبارتیں اور اقتباسات بھیج کر اپنے سیاسی مقصد کی تکمیل کرتے اور اپنے مخالفین کو نشانہ بنایا کرتے ہیں ان ۵۰ سال میں امت کے اندر جو بھی انتشار پیدا ہوا ہے اس میں کم و بیش ۹۰ فیصدی واقعات میں فتوے ضرور شامل ہیں۔ ان فتوؤں نے خاموشی شاید بڑے نام ہی پہنچائے ہیں۔ البتہ امت کے انتشار اور دین کی بے وقری کو ان باتوں سے بڑا سہارا ملا ہے یہ بات شاید ہمارے منصب سے بلند ہے کہ ہم اصحاب فتویٰ کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں البتہ علمائے کرام سے ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خواہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں ان پچھلے تجربات کے پیش نظر فتویٰ دینے کے سلسلے میں کچھ ایسے اصول مرتب کریں جن سے ملت کے اتحاد کو ان دینی راستوں سے نقصان پہنچنے کا امکان باقی نہ رہے۔ (ایضاً)

جریدہ مذکورہ نے اپنی اگلی اشاعت میں مستفتی صاحب کا ایک خط شائع کیا ہے جو انہوں نے ان کے جریدہ کی پہلی اشاعت میں شائع شدہ مذکورہ تفصیلات و تاثرات کے جواب میں لکھا۔ قارئین کے لئے اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سنئے!

آپ کا مرسلہ خط ملا۔ آپ کے مخلصانہ مشوروں نے میری نفسانی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر اور مجھے اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ ۲۲ر دسمبر کا سہ روزہ ایڈیشن بھی آپ کی راست گوئی و صلح پسندی کا مظہر ہے۔ کاش ملت اسلامیہ کے ہر فرد میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا۔

"قاری محمد طیب صاحب کی کتاب کے اقتباسات کو استفتار کی شکل میں بھیج کر فتویٰ کو شائع کرنے میں ہمارے نیک مقاصد ضرور رہتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپ نے "شکایت ہے ہمیں" کے ذیل جو سرزنش مستفتی کی کی ہے اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن ایک حقیقت کا اظہار کردوں تو انشاء اللہ آپ کی شکایت دور ہو جائے گی۔ میں نے کتاب کے بعض اجزار کے متعلق اپنے اساتذہ نیز قاری صاحب موصوف سے بارہا سمجھنا چاہا۔ لیکن "عدیم الفرصتی" نے ان کو شاید موقعہ نہ دیا۔ میری درخواست ہے کہ اس کتاب کو ایک نظر آپ بھی دیکھ لیں۔

بہر حال اس کی اشاعت کا جو مقصد ہمارا تھا اس کے متعلق آپ نے بہت احسن طریقے پر تحریر فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ اتفاق و اتحاد بین المسلمین کی صورت پیدا کردے۔ آمین۔

(الیشیا" لاہور۔ بابت ۱۲ر جنوری ۱۹۶۳ء)

اس خط کی اشاعت کے ساتھ معاصر دعوت نے فتوؤں کے مروجہ طریق کار کا رونا بھی رو دیا ہے اور اس میں اصلاح د

ترمیم کے طور پر بعض تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

ہم بھی جناب مستفتی کی دعا میں شریک ہیں اور آرزومند ہیں کہ یہ امت جو عرصے سے اتحاد و اتفاق کی اصطلاحوں کو محض پڑھتی ہے لیکن ان کی عملی شکل دیکھنے کو ترس چکی ہے۔ خدا اسے اس نعمت سے سرفراز کرے۔ بات فتوے کی تھی جس کے سلسلے میں حضرات مفتیان کرام کی بیشتر یہ رائے رہی ہے کہ مفتی کو ان لوگوں کے عقائد کی تحقیق و تفتیش کی کوئی ضرورت نہیں جن کے بارے میں فتویٰ پوچھا جا رہا ہے۔

ان کا کام تو بس یہ دیکھنا ہے کہ پیش نظر تحریر سے کیا مدعا ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح بے شک مفتی کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن امت کے عوام اور خواص کو ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے اپنی پچھلے ستر اسی سال کی تاریخ فتاویٰ پڑھ ڈالئے۔ اس دور میں ایسے ہی چند اقتباسات کی بنیاد پر جو ہنگامے بپا ہوئے ہیں ان کی یاد بہت سے ذہنوں میں تازہ ہو گی۔ سر سید۔ مولانا نانوتوی۔ حاجی امداد اللہ۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا گنگوہی۔ شیخ الہند مولانا احمد رضا۔ مولانا ثناء اللہ۔ علامہ شبلی۔ مولانا فراہی۔ ڈاکٹر اقبال۔ علامہ مشرقی۔ مولانا تھانوی۔ مولانا محمد علی۔ مولانا مودودی اور کس کس کو یاد کیجئے۔ آخر کتنے علماء اور مفکرین امت ہیں جو کسی نہ کسی کے نزدیک گمراہ۔ مشرک۔ منکر اور کافر قرار دئے جا چکے ہوں اور پھر اس سلسلے کے ایک ایک فتوے نے افتراق امت اور انتشار کے فتنوں کو جنم نہ دیا ہو۔

اس طرح کے فتوے جب دئے جا رہے ہوں گے اس وقت اصحاب فتویٰ کے ذہن میں یقیناً یہی بات ہوگی کہ وہ دین کی حفاظت اور اپنی قدروں کو بچانے کے لئے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن اس دنیا میں اچھے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ شرارت پسندی اور فتنہ جوئی بھی کارفرما ہے اور اکثر یہی ہوا ہے کہ فتنہ جو اور انتشار پسند عناصر نے حضرات مفتیان عظام کو اپنے ناپاک ارادوں کی خاطر استعمال کر لیا اور وہ بچارے اپنی سادہ لوحی کا ماتم کرتے رہ گئے۔ کسی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر اس کے خلاف رائے دینا اور بات ہے۔ اور اس کے شرائط بھی کچھ اور ہیں لیکن بغیر جانے بوجھے کسی ایک بات پر کفر و انکار جیسے فیصلے کو نافذ کر دینا بالکل دوسری بات ہے۔

ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ آپ ایک ملک کے شہری ہیں۔ اس ملک کے دوسرے شہریوں کی طرح آپ بھی بعض معاملات پر اپنے طور سے کچھ بولتے اور کچھ لکھتے رہتے ہیں اب ایک عام آدمی آپ کے بولے اور لکھے ہوئے کچھ الفاظ اور جملے جمع کر کے ایک ضلع مجسٹریٹ کے پاس بھیج دے کہ ایک شخص اس طرح کے خیالات رکھتا ہے اور ضلع مجسٹریٹ اس کے جواب میں یہ لکھے کہ ایسے خیالات رکھنے والے کو حق

شہریت سے محروم قرار دینا چاہیئے تو کیا آپ اسے انصاف کے مطابق قرار دیں گے؟ آپ یقیناً یہ کہیں گے کہ جس ضلع مجسٹریٹ نے حالات کی تحقیق اور شخص متعلقہ سے استفسار کئے ہوئے بغیر یہ فیصلہ کیا ہے وہ اور کچھ ہو تو ہو، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہے۔ جس طرح کسی مجسٹریٹ کا فیصلہ متعلق عدالت اور متعلقہ قانون کی عظمت و وقار کا ضامن ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک فتویٰ بھی فتویٰ دینے والے عالم اور متعلقہ نظامِ حیات کے مقام کو متعین کرتا ہے ایک زمانہ تھا جب ہمارے علماء کے ان فتووں کی تائید میں پوری امت کھڑی ہو جاتی تھی اور بڑی سے بڑی حکومتیں تک ان کی تاثیر سے گھبرایا کرتی تھیں لیکن آج ان کی بے اثری عبرت انگیز بن چکی ہے۔ بہرحال یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر سب سے زیادہ حضرات مفتیان کرام ہی کو غور کرنا ضروری ہے۔

ایک گزارش

بات ان فتووں پر چل رہی تھی جو بعض لوگوں کی تحریروں کے اقتباسات پڑھ کر صادر کئے جاتے رہے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ جب یہ طریقہ امت میں بیشتر پھوٹ ڈالنے کا ہی سبب بنتا رہا ہے تو پھر اس پر ذرا سی تبدیلی کرنے پر غور کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ کسی اقتباس پر فتویٰ نہ دیا جائے جب تک کہ وہ پوری کتاب یا اس کا متعلقہ باب نظر سے نہ گزر جائے جس سے یہ اقتباس لیا گیا ہے۔ اگر کوئی کتاب یا اس کا کچھ حصہ قابلِ اعتراض ہے اور اس کا لکھنے والا زندہ ہے تو اس سے اس قول کا مفہوم متعین کرایا جائے۔ نیز جو اعتراضات اس پر وارد ہوتے ہیں وہ اس کے علم میں لا کر ان کا جواب حاصل کر لیا جائے۔ اگر قائل زندہ نہیں ہے تو اس کی دوسری تحریروں یا اس کے معتقدین اور شارحین سے اس قول کی تشریح کرائی جائے۔

پھر ان سب احتیاطوں کے باوجود کوئی جماعت امت کے متفقہ عقیدہ سے انحراف کرتا ہے تو اس کے خلاف ایک فتویٰ ہی سے نہیں بلکہ امت کی اجتماعی قوت کا سہارا لے کر محاذ کھڑا کر دینا چاہیئے۔ بہرحال یہ ذمہ داری ہمارے دور کے علماء کی ہے کہ وہ تمام حالات کا لحاظ کر کے منصب افتاء کی ذمہ داریوں کے مسئلہ پر غور کریں۔ اور پچھلے تجربات کی روشنی میں کچھ نہ کچھ حدبندیاں ضرور قائم کریں۔

(ایضاً)

حقیقت کیا ہے | ہمارا مقصد ان تجاویز کی مخالفت قطعاً نہیں، بلکہ ہم ان سے پوری طرح متفق ہیں۔ ہمیں ان کی ضرورت و اہمیت کا بھی شدید احساس ہے۔ ہم بہت پہلے مروجہ فتوے بازی کے تباہ کن نتائج تفصیلاً ملت کے سامنے لا چکے

ہیں اور بڑی وضاحت سے یہ بتا چکے ہیں کہ کافر گری کا یہ منافرت انگیز رجحان کس شدت سے امت کے مختلف فرقوں میں نفرت و عداوت کی آگ بھڑکائے چلا آرہا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہم نے جو کچھ کہا تھا آج بعض گوشوں میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے لیکن اس اظہار مسرت کے ساتھ ہمیں اندیشہ ہے کہ ان تجاویز کو ایک رسمی اور ہنگامی اپیل سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ اب اگر یہ صدائیں بلند ہوتی ہیں تو یہ اس لئے نہیں کہ انہیں ملت کا اتحاد یا اجتماعی مفاد عزیز ہے۔ ملت کے اجتماعی مفاد کے نام پر ایسی تجاویز صرف اس وقت منظر عام پر لائی جاتی ہیں۔ جب ان فتاویٰ کی زد اپنے فرقے کے کسی پیشوا پر پڑ رہی ہو اگر مفتیوں کے قلم کی نوک کسی ایسی شخصیت کو اپنی زد میں لاتی ہے جو کسی دوسرے فرقے سے وابستہ ہو تو پھر نہ امت کا اتحاد خطرے میں پڑتا ہے نہ دین کی عزت و ناموس پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ فتوے بازی کی یہ دھاندلی قابل اعتراض دکھائی دیتی ہے۔

قاری محمد طیب صاحب اگر مولانا قاسم نانوتوی مرحوم کی ذات گرامی سے کفر کے فتوے کے داغ دھونے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ یہ دین و امت کے اجتماعی مفاد کا تقاضا ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ مرحوم اسی دارالعلوم کے بانی تھے۔ جس کے مہتمم ہونے کا شرف اب قاری صاحب کو حاصل ہے اور اب جو قاری محمد طیب صاحب پر فتویٰ صادر ہوا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ جو حضرات اس پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں اور فتوے بازی کی دھاندلی میں اصلاح و ترمیم کے نعرے بلند کر رہے ہیں تو وہ بھی محض اس لئے کہ ان کے عقائد کا رشتہ قاری صاحب کے مسلک سے بندھا ہے۔ محترم عامر عثمانی صاحب نے اگر مولانا قاسم مرحوم کی حمایت میں زور قلم دکھایا ہے تو ان کا پمفلٹ صاف شہادت دے گا کہ ان کے سامنے بھی اصل معاملہ مولانا مرحوم کا نہیں بلکہ جماعت اسلامی اور اس کے امیر کے ساتھ اپنے تعلقات کی بنا پر انہیں یہ سب کچھ اس لئے کرنا پڑا کیونکہ دیوبند کے مفتیان کرام نے امیر جماعت اسلامی کے خلاف بھی اس قسم کے کفر کے فتوے صادر فرمائے تھے اور انہیں زیادہ سے زیادہ بدنام کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ بانی دارالعلوم دیوبند کے خلاف شائع ہونے والے فتوے کو اس انداز سے پمفلٹ میں لایا جاتا بصورت دیگر شاید وہ اس فتوے کا ذکر تک پسند نہ کرتے۔ کفر کے فتووں کی مذمت میں اگر کہیں کہیں اس قسم کا جوش، اصلاح و ترمیم کے دعووں میں انگڑائی لیتا نظر پڑتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ یہ فتوے ان داعیان اصلاح کے اپنے مسلک و عقیدہ کے بزرگوں کے خلاف صادر ہوتے ہیں۔ یہی فتوے جب کبھی کسی مخالف فرقے کے زعماء پر عائد ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ اس وقت نہ ان کی مذمت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ اصلاح و ترمیم کا بھولے سے بھی کوئی خیال آتا ہے۔ اس وقت نہ تو ملی اتحاد اور وحدت امت کا کوئی تقاضا ان کے دل میں ابھرتا ہے اور نہ اس کے لئے قلم میں کوئی ادنیٰ حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت میں تو ان کے ہاں یہ حرکت بھی مذموم نہیں قرار پاتی کہ فتاویٰ کے اندر اقتباسات نقل کرنے میں بھی بددیانتی اختیار کی جاتی ہے۔ اور ان سے گمراہ کن مفہوم اخذ کرنے میں عمداً کذب و افترا سے کام لیا جاتا ہے۔

اس کی مثال

یقین فرمائیے کہ ہم یہ کچھ کسی الزام بازی کی نیت یا تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہے بلکہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے پیشِ نظر عرض کر رہے ہیں۔ پچھلے سال ہی کے ایک واقعہ کو لیجئے۔ مختلف فرقوں کے مولوی حضرات اور مفتی صاحبان نے ایک خالص سیاسی مقصد کے تحت، محترم پرویز صاحب کے خلاف فتویٰ شائع کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس ضرورت کو انہوں نے بڑی آسانی سے پورا کر لیا۔ یعنی پرویز صاحب کی تحریروں میں سے ایک ایک آدھ آدھ فقرہ مختلف مقامات سے نقل کیا اور اس طرح فردِ جرم مکمل کر کے ایک پمفلٹ کی صورت میں یہ اعلان شائع کر دیا کہ پرویز صاحب کافر ہیں۔

اقتباس اخذ کرنے کی بددیانتی کی صرف ایک مثال کو لیجئے کہ "خدا کے تصوّر" سے متعلق عام تحریروں کے علاوہ پرویز صاحب کی ایک مستقل تصنیف سنہ ۱۹۴۹ء سے موجود تھی اور اب تک اس کے ڈیڑھ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ عمداً نظرانداز کر کے ان کی نو سو صفحات کی ایک اور ضخیم کتاب "معراجِ انسانیت" سے حسبِ ذیل عبارت سیاق و سباق سے الگ کر لی گئی۔

> ... اور چونکہ خدا عبارت ہے ان صفاتِ عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرتِ عالیہ کے قوانین کی اطاعت ہے۔

اور پھر اس عبارت سے یہ گمراہ کن مفہوم پیدا کر لیا کہ

> پرویز صاحب خدا کے خارجی وجود کے منکر ہیں۔

جب یہ مفہوم پیدا کر لیا گیا تو پھر کافر قرار دینے میں کیا رکاوٹ باقی تھی!

مفتی محمد شفیع صاحب کے نام ایک وضاحتی خط میں پرویز صاحب نے اپنی تحریروں سے کم و بیش ایک درجن اقتباسات پیش کر کے واضح طور پر بتلایا کہ ذات تو ذات، وہ تو خدا کی صفات تک کے مستقل بالذات اور موجود فی الخارج ہونے پر ایمان محکم رکھتے ہیں اور ساتھ ہی مذکورہ عبارت کو بھی اس کے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کر کے واضح کیا کہ اقتباس نقل کرنے میں صریح بددیانتی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مفتی صاحب کا جواب یہ تھا کہ

> آپ اس قسم کی کوئی عبارت یا اقتباس پیش نہیں کر سکے۔

اور آخر میں ایک آمرِ مطلق کے انداز میں یہ کہہ کر سلسلۂ مراسلت ختم کر دیا کہ

> مجھ سے مراسلت کی زحمت نہ کریں۔ نہ مجھ سے آئندہ کسی مراسلت کے جواب کی توقع کریں۔

مولانا حالی نے انہی کی شان میں تو کہا تھا۔

> ستوں چشمِ بد دور ہیں آپ دیں کے　　　نمونہ ہیں خُلقِ رسولِ امیں کے

یہ سب کچھ ہوا لیکن وحدتِ امت اور ناموسِ دین کے محافظوں کی زبانوں پر سکوت کی مہریں لگی رہیں بلکہ بڑے فخر سے یہ دلیلِ محکم پیش کی گئی کہ دیکھئے صاحب! تمام فرقوں کے علماء کے دستخط ثبت ہیں پھر اس فتوے کے صحیح ہونے میں کیا شبہ رہ گیا۔ حالانکہ سب

فرقوں کے نمائندوں کے دستخط اس لئے ثبت ہوئے کہ پرویز صاحب کا تعلق کسی فرقے سے نہیں تھا۔ جس طرح مولانا قاسمؒ مرحوم اور قاری محمد طیب صاحب کے خلاف کفر کے فتوے شائع ہونے پر ان کے فرقہ و مسلک کے لوگ ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے بعینہٖ اگر پرویز صاحب بھی کسی فرقے سے وابستہ ہوتے تو اس فرقے کے لوگ بھی ان کی حمایت میں لازماً کھڑے ہو جاتے۔ لیکن وہ تو فرقہ بندی کو ہی قرآن کی رو سے شرک سمجھتے ہیں اور اس لئے کسی فرقے سے متعلق نہیں تھے۔ ایسی صورت میں کوئی فرقہ ان کی حمایت کیوں کرتا۔ ہر فرقہ دوسرے فرقوں کو کافر گردانے پر تو فخر کر سکتا ہے اور ایسا کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی فرقہ اس شخص کی حمایت میں بھی اٹھتا جس کا مقصدِ حیات ہی سب فرقوں کو مٹا کر امت میں وحدت و اتحاد قائم کرنا ہے۔

اب کہا جا رہا ہے اور بڑے ہی درد بھرے احساس سے کہا جا رہا ہے کہ

جب یہ طریقہ امت میں بیشتر پھوٹ ڈالنے کا ہی سبب بنتا رہا ہے تو پھر اس میں ذرہ سی تبدیلی پیدا کرنے پر غور کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ کسی اقتباس پر فتویٰ نہ دیا جائے جب تک کہ وہ پوری کتاب یا اس کا متعلقہ باب نظر سے نہ گزر جائے جس سے یہ اقتباس لیا گیا ہے۔ اگر کوئی کتاب یا اس کا کچھ حصہ قابلِ اعتراض ہے اور اس کا لکھنے والا زندہ ہے تو اس سے اس کا مفہوم متعین کرایا جائے نیز جو اعتراضات اس پر وارد ہوتے ہیں وہ اس کے علم میں لا کر اس کا جواب حاصل کر لیا جائے۔ کس قدر معقول اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ یہ مشورے جو اب فتوے بازی کے طریق میں اصلاح کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں لیکن افسوس کہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ مشورے دیئے اس وقت جاتے ہیں جب کسی فرقے کا اپنا خرمن کافر گری کے شعلوں کی زد میں آتا ہے۔ پرویز صاحب کے معاملے میں تو کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ انہوں نے صفائی کے طور پر جو واضح حقائق پیش کئے تھے کوئی انہیں ہی اپنے ہاں شائع کر دیتا۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، فتوے بازی سے متعلق یہ تجاویز بڑی معقول ہیں اور انہیں ضرور اختیار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ ان تجاویز پر عملدرآمد صرف اس وقت نہیں ہونا چاہیئے جب کسی فتویٰ کی زد اپنی پارٹی کے کسی فرد پر پڑتی ہو۔ کفر کا فتویٰ کوئی بھی شائع کرے اور کسی کے خلاف بھی کیوں نہ شائع کرے، ملک کے اہلِ قلم اور اہلِ زبان حضرات کو متفقہ طور پر اس کی مخالفت کرنی چاہیئے اور یہ پوچھنا چاہیئے کہ کیا فتویٰ دینے والے نے اس طریق کو اختیار کیا تھا جس کا ذکر ان تجاویز میں کیا گیا ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہو تو اس کی بہ یک زبان مذمت اور مخالفت کرنی چاہیئے۔ اگر ایسا کیا گیا تو پھر امید ہو سکتی ہے کہ امت اس افتراق اور انتشار سے بچ جائے گی جو اس وقت ان کافر ساز لوگوں کی وجہ سے اس کے خرمنِ امن و سلامتی اور متاعِ عزت و ناموس کو بری طرح تباہ و برباد کر رہا ہے۔

اس مقام پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ خود منصب کافر گری کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں کچھ عرض کر دیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ

اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مفتیوں کا کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اس دور میں ہر ایک کو یہ فکر لاحق ہوتی تھی کہ کافروں کو کس طرح حلقہ بگوشِ اسلام بنایا جائے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ مسلمانوں کو کس طرح کافر قرار دیا جائے۔ جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو بادشاہوں یا ان کی مقرر کردہ عدالتوں کو اس کی ضرورت پیش آئی کہ وہ کسی معاملہ زیرِ غور کے متعلق دریافت کریں کہ اس باب میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ جن حضرات سے یہ پوچھا جاتا تھا وہ مفتی کہلاتے۔ یعنی مفتیوں کا کام کم و بیش وہی تھا جسے آج کل وکلاء حضرات سرانجام دیتے ہیں۔ ان کا کام فیصلہ دینا نہیں تھا بلکہ محض مشورہ دینا تھا۔ رفتہ رفتہ عام لوگوں نے بھی ان (مفتی) حضرات سے مسائل پوچھنے شروع کر دئیے اور اس طرح ایسے معاملات میں جو قانون کی زد میں نہیں آتے تھے ان حضرات کے "مشورے" فیصلوں کی حیثیت اختیار کرنے لگے۔ یہی کیفیت اس وقت تک جاری ہے اور یوں ان حضرات نے سمجھ لیا ہے کہ وہ دوسروں کے کفر اور اسلام کے متعلق فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ یہی وہ بنیادی غلط فہمی ہے جس کی وجہ سے کافر سازی کا بازار اس قدر گرم رہتا ہے اور امت اس اندرونی خلفشار کے ہاتھوں تباہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس وقت امت کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو کافر بن چکا ہو۔ لیکن تماشا یہ ہے کہ جو خود کافر قرار دئیے جا چکے ہیں وہ بدستور دوسروں کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس بات کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے کہ یہ متعین کیا جائے کہ فلاں شخص مسلمان ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کی ضرورت قانونی ہے۔ مثلاً آئینِ پاکستان میں یہ شق موجود ہے کہ صدرِ مملکت مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ یہ متعین کیا جائے کہ جو شخص منصبِ صدارت کے لئے امیدوار ہے (یا منتخب کیا جا رہا ہے) وہ اس شرط کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ اس وقت تک کسی نے یہ سوال اٹھایا نہیں۔ اگر یہ سوال اٹھایا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے متعلق حکومت کی کوئی مستند اتھارٹی ہی فیصلہ دے گی نہ کہ زید، بکر، عمر۔ (اصل یہ ہے کہ اس کے متعلق خود آئین کے اندر تصریح ہونی چاہیئے کہ اس منصب کے لئے مسلمان کسے تصور کیا جائے گا — جس طرح مثلاً یہ تصریح موجود ہے کہ ووٹر کون ہو سکتا ہے۔)

ان اشارات سے واضح ہے کہ اس امر کا حق کسی فرد کو حاصل ہی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ دوسروں کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کرے۔ اس کا فیصلہ حکومت کو کرنا چاہیئے۔ جب حکومت اسے اپنے ہاتھ میں لے لے تو پھر یہ چیز قانوناً ممنوع ہو جائے گی کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کفر اور اسلام کے متعلق فتوے صادر کرے۔ یہ ہے اس کافر سازی کے فتنہ کو روکنے کا اصل طریق۔

ہر خطا معصوم ہو کر رہ گئی

مختلف اور متضاد فتوے بازیاں

یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ معاصر "مدینہ" بجنور کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس میں مولانا عبدالحق صاحب انچارج دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند کا ایک اعلان نمایاں طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ایک فتویٰ بھی شامل ہے۔ چونکہ اس اعلان اور فتوے کا زیر نظر مضمون سے گہرا تعلق ہے اس لئے اسے اس مضمون میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ آپ اس سے بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ بعض مصلحتیں ہمارے مذہبی اجارہ داروں اور فتوے بازوں کو کیا کیا کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور اس مقصد کے لئے دینِ خداوندی سے کس قسم کا مذاق روا رکھا جاتا ہے۔

اس مضمون میں یہ تفصیل آپ کے سامنے آچکی ہے کہ چند سال قبل ایک تحریر کی بنا پر دیوبند سے کفر کا فتویٰ صادر ہوا لیکن بعد میں جب یہ انکشاف ہوا کہ مذکورہ تحریر خود دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی مرحوم کی ہے اور اس فتوے سے دارالعلوم دیوبند کی ساری عزت خاک میں مل جائے گی تو قاری محمد طیب صاحب جو دارالعلوم کے مہتمم (اور مولانا قاسمؒ مرحوم کے پوتے بھی) ہیں کو مرحوم کی برأت کے لئے کافی نشر و اشاعت کا اہتمام کرنا پڑا۔

دیوبند کے لئے یہ دوسرا سانحہ تھا کہ گزشتہ دسمبر میں ایک کتاب سے کچھ اقتباسات بغرض استفتاء دارالافتاء دیوبند میں ارسال کئے گئے اور وہاں کے مفتی جناب سید مہدی حسن صاحب نے کتاب مذکورہ کے مصنف پر اسی قسم کا فتویٰ عائد کر دیا جو مولانا قاسم مرحوم کے خلاف صادر ہوا تھا۔ لیکن بعد میں جب پردہ اٹھا اور یہ حقیقت سامنے آئی کہ مذکورہ اقتباسات جس کتاب سے لئے گئے ہیں وہ خود قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے فکر کا شاہکار ہے تو دیوبند کے اصاغر و اکابر پر قیامت سی گزر گئی اور اس فتوے کا اثر زائل کرنے کے لئے پورا دارالعلوم حرکت میں آگیا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی معاصر "مدینہ بجنور" کی اشاعت مذکورہ میں سامنے آئی۔ پہلے انچارج دفتر اہتمام دیوبند کا اعلان ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

مفتی مہدی حسن صاحب غور فرمائیں!

اخبار "دعوت" دہلی ۲۲ر دسمبر ۶۲ء میں جو ایک استفتاء اور فتویٰ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم کی کتاب کے اقتباسات سے متعلق شائع ہوا ہے۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی ذات اپنی صحتِ علم و عقائد کے ساتھ علمی اور عوامی حلقوں میں معروف ہے اس لئے قدرتی طور سے "یہ نئی بات تھی" اطراف ملک کے علمی اور عوامی حلقوں سے متعدد استفسارات موصول ہوئے۔ ان استفسارات کے پیش نظر مستفتی کے پیش کردہ اقتباسات پر دارالافتاء نے ازسرِنو تحقیقی توجہ دی اور مفصل جواب حضرت مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب نائب مفتی نے تحریر فرمایا اور بہ نظرِ احتیاط اس جواب پر حضرت مولانا مفتی

محمود احمد صاحب نانوتوی مفتی مالوہ ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند ونگراں دارالافتاء رضیانسب مجلس شوریٰ اور تمام اکابر اساتذہ نے پورے غور وفکر کے بعد تصدیقی دستخط ثبت فرمائے۔ اس سے قبل خود حضرت مہتمم صاحب کا اس مسئلہ سے متعلق وضاحتی بیان مختلف اخبارات میں آچکا ہے، ہمیں امید ہے کہ متعلقہ حلقوں کی غلط فہمی اس فتوے کی اشاعت کے بعد دور ہو جائے گی۔ مکمل اقتباسات اور فتویٰ "پندرہ روزہ میثاق دیوبند" اور "ماہنامہ دارالعلوم" میں شائع ہو چکا ہے۔ عوام کے فائدہ کے لئے اس کا خلاصہ شائع کیا جا رہا ہے۔

(مولانا) محمد عبدالحق - انچارج دفتر اہتمام، دارالعلوم دیوبند

۱۹ - ۸ - ۶۲ء

(مدینہ بجنور ۲۸ - جنوری سنہ ۶۳ء)

اس کے بعد وہ اقتباسات درج ہیں جو مستفتی نے دارالافتاء کو بھیجے تھے اور جنہیں پیش نظر رکھتے ہوئے مفتی مہدی حسن صاحب نے فتویٰ صادر فرمایا تھا ـــ یہ اقتباسات اور فتوے آپ کے سامنے آچکے ہیں ـــ اب ان ہر چہار اقتباسات پر ازسرنو تحقیق و توجہ فرمائی کے بعد جو نیا فتویٰ سامنے آیا وہ بھی ملاحظہ ہو۔ فرمایا گیا ہے کہ

الجواب

اقتباسات مذکورہ سوال میں کوئی امر عقائد اسلام سے متصادم نہیں ہے۔ بلکہ ان کی حیثیت لطائف و نکات کی ہے جن کے لئے اسلامی روایات میں ماخذ ومبنیٰ موجود ہے۔ ذیل میں حسب ترتیب وارد ان اقتباسات پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) اس اقتباس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ حضرت مریمؑ صدیقہ کے سامنے حضرت جبریل علیہ السلام جس بشر سوی کی صورت میں متمثل ہوئے تھے وہ صورت شبیہ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام تھی اس سلسلہ میں یہ تو ظاہر ہے کہ جو چیز بھی متمثل ہو کر آئی تھی وہ مرد کامل کی شکل میں تھی۔ لیکن نص اس سے خاموش ہے کہ کس انسان کی شکل میں تھی۔ اب اگر کوئی شخص اس بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر اسویا کے فرد کامل اور مصداق اتم تھے اور بطور لطیفہ اس شبیہ کو شبیہ محمدی سے تعبیر کرے تو یقیناً اس کو حق پہنچتا ہے اور اقتباس میں اس متمثل کو حضرت جبریلؑ ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے مخالف جمہور کا الزام بھی مصنف کتاب پر عائد نہیں ہوتا۔

(۲) اس اقتباس پر بھی خلجان برمحل نہیں ہے کیونکہ خلجان اس وقت صحیح ہوتا جب کہ ابن احمد نبی لکھا ہوتا۔ لیکن عبارت اقتباس میں کھلے لفظوں میں (ابن احمد تمثالی) درج کیا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ ابن تمثالی

روحی اور اپنی نسبی میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

(۳و۴) ان اقتباسات میں حضرت مسیح علیہ السلام کو خاتم الانبیاء بنی اسرائیل یعنی آخر انبیاء بنی اسرائیل کہا گیا ہے جو صحیح ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم جمیع الانبیاء ظاہر کیا گیا ہے۔ اور یہی اسلامی عقیدہ ہے یہ بعینہٖ وہی تعبیر ہے جو حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر ابن کثیر میں اختیار کی ہے فرماتے ہیں۔ فعیسی علیہ السلام وھو خاتم انبیاء بنی اسرائیل وقد اقام فی ملأ بنی اسرائیل مبشرًا بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وھو احمد خاتم الانبیاء والمرسلین الذی لا رسالۃ بعدہ ولا نبوۃ۔ اس لئے دونوں اطلاقات میں کسی منافاۃ وتضاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے اور اقتباس نمبر ۴ میں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر باپ کا اطلاق کیا ہے تو یہ اطلاق نسبی اعتبار سے نہیں ہے اگر معاذ اللہ ایسا ہوتا اور آپ کو حضرت مسیح علیہ السلام کا نسبی باپ کہا گیا ہوتا تو اس کے بطلان میں کیا کلام تھا۔ لیکن یہاں تمثیلًا دیگر وجوہ ومناسبات کی بنا پر ایسا اطلاق کیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مردوں کے باپ ہونے کا اطلاق علاقہ نسبیت کی بنا پر یقینًا ناجائز ہے لیکن وہ یہاں کیا ہی نہیں گیا ہے۔ رہا یہ کہ دیگر وجوہ اور مناسبات کے ذیل میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر روحانی باپ ہونے کا اطلاق کیا جائے تو دیکھا اس میں کوئی محذور لازم نہیں آتا بلکہ ثابت بھی ہے۔ صاحب روح المعانی نے النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم کی تفسیر میں حضرت ابی کی روایت وھواب لھم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ واطلاق الاب علیہ صلی اللہ علیہ وسلم لانہ سبب للحیاۃ الابدیۃ کما ان الاب سبب للحیاۃ ایضًا تو دیکھو دیگر جہات کی بنا پر آپ پر امت کے باپ ہونے کا اطلاق کیا گیا ہے اور اس کو ماکان محمد ابا احد من رجالکم ــــــ کے خلاف نہیں سمجھا گیا۔ اور نہ خلاف سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس کتاب میں تو یہ اطلاق بھی نہیں کیا گیا ہے۔ صرف صورت اور شباہت محمدی کو بمنزلہ باپ کہا گیا ہے۔

بہر حال اقتباسات مذکورہ پر شرعی لحاظ سے کسی تصادم عقیدہ یا اسلامی نظریات کی مخالفت کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا ہے۔ اقتباسات متذکرہ قطعًا بے غبار ہیں۔

(محمد جمیل الرحمٰن غفرلہٗ نائب مفتی۔ دار العلوم دیوبند)

(ایضًا)

بعینہٖ یہی اقتباسات تھے جن پر فتوے صادر کئے ہوئے اسی دارالافتاء کے مفتی مہدی حسن صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ

ان اقتباسات کا قائل قرآن عزیز کی آیات میں تحریف کر رہا ہے بلکہ درپردہ قرآنی آیات کی تکذیب بلکہ ان کا انکار کر رہا ہے ... شخص مذکور ملحد اور بے دین ہے۔ عیسائیت اور قادیانیت کی روح اس کے جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے ... الحاصل یہ اقتباسات قرآن و احادیث اور جملہ مفسرین اور اجماع امت کے خلاف ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے شخص کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے جب تک توبہ نہ کرے۔

اور اب دارالعلوم دیوبند کے تمام اکابر اساتذہ کی تصدیق و تائید کے ساتھ اسی دارالافتاء کے نائب مفتی مولانا جمیل الرحمٰن کے دستخطوں سے یہ دوسرا فتویٰ شائع ہوتا ہے اور بے چاری امت کو بتایا جاتا ہے کہ

اقتباسات مذکورہ سوال میں کوئی امر عقائد اسلام سے متصادم نہیں ہوتا بلکہ ان کی حیثیت لطائف و نکات کی ہے جن کے لئے اسلامی روایات میں ماخذ و مبنیٰ موجود ہے ... اقتباسات مذکورہ پر شرعی لحاظ سے کسی تصادم عقیدہ یا اسلامی نظریات کی مخالفت کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اقتباسات مذکورہ قطعاً بے غبار ہیں۔

اللہ اللہ - خیر صلا۔

غور فرمائیے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ قاری صاحب کو کفر کے فتوے سے بریت دلانے کا اعلان شائع ہوتا ہے، انچارج دفتر اہتمام کی طرف سے جو مہتمم صاحب (قاری محمد طیب) کے دفتر کے ایک ماتحت ملازم ہیں۔ اور ان کی بریت کا فتویٰ صادر فرماتے ہیں دارالافتاء کے نائب مفتی مولانا محمد جمیل الرحمٰن صاحب جو خود قاری صاحب کے زیر تحت دارالافتاء کے ایک رکن ہیں۔ اس کی تصدیق فرماتے ہیں وہ "اکابر اساتذہ" جن کی حیثیت کسی مفتی کی نہیں بلکہ خود قاری صاحب ہی کے زیر اہتمام ایک تنخواہ دار مدرس سے زیادہ نہیں۔ سوچئے کہ اگر کفر کا فتویٰ قاری محمد طیب صاحب کے بجائے کسی دوسرے شخص کے خلاف شائع ہوتا تو پھر بھی یہ سب حضرات اس کی سیاہی دھونے کے لئے اس قدر سرگرمی دکھاتے؟ کیا یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہوا کہ جس شخص کے خلاف فتویٰ صادر ہوا تھا وہ دارالعلوم دیوبند کا مہتمم تھا۔ اور یہ سب صاحبان ان کے زیر اہتمام ملازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سوال پر بھی سوچنا پڑے گا کہ اگر بربنائے شریعت دارالافتاء کے نائب مفتی صاحب کا یہ فتویٰ درست ہے تو پھر وہاں کے بڑے مفتی صاحب کے پہلے فتوے کی حیثیت کیا رہی؟ یہی نہیں بلکہ بربنائے مفتیان کرام کے دستخطوں اور مہروں سے جو لاتعداد فتوے صادر ہوتے ہیں ان کی دینی حیثیت کیا ہوگی؟

یہ ہے حقیقت ان شکاروں کی جن سے آئے دن مسلمانوں کے خلاف کفر کے فتاویٰ صادر ہوتے رہتے ہیں! معلوم نہیں بے چاری امت اس عذاب سے کب نجات حاصل کر سکے گی۔ مسکیں دکم ماندہ دریں کشمکش اندر۔

مجلسِ اقبالؒ

(مثنوی: پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق - قسط ۵)

سابقہ عنوان میں علامہ اقبالؒ نے "حکمتِ کلیمیؑ" کی وضاحت کی تھی۔ یعنی یہ بتایا تھا کہ جب سیاست کو وحی کے تابع رکھا جائے تو اس کے نتائج کیا مرتب ہوتے ہیں اس سے اگلا عنوان ہے۔

حکمتِ فرعونی

جو آج کی نشست میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس سیاست بے دین کی اساس و بنیاد، اور مقصود و مطلوب، دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں چار لفظوں میں سما دیا گیا ہے اور اس حسن و خوبی سے جو اقبالؒ کے اسلوبِ بیان کی اولین خصوصیت ہے ملاحظہ فرمائیے۔

حکمتِ اربابِ دیں کردم عیاں — حکمتِ اربابِ کیں را ہم بداں
حکمتِ اربابِ کیں مکر است و فن — مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن!

اس سیاست کا مقصود و منتہیٰ ہوتا ہے ـــــ تخریبِ جاں، تعمیرِ تن ـــــ یہی وہ چار لفظ ہیں جن میں اس سیاست کی روح کھنچ کر آگئی ہے۔

زندگی کے متعلق دو تصورات ہیں۔ ایک تصور یہ کہ انسان عبارت ہے اپنے طبیعی جسم سے۔ یہ طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا ہے اور انہی قوانین کے مطابق اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام کد و کاوش کا ماحصل یہ ہے کہ اس کی دنیاوی زندگی خوش حالی میں گزرے۔ یہی تصور جب ایک قوم کا منتہائے نگاہ

قرار پا جائے تو اس کا مقصدِ حیات یہ ہوتا ہے کہ کمزور اقوام کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان پیدا کیا جائے۔ اس میں نہ کسی اصول کا خیال رکھا جاتا ہے نہ بلند اقدار کا لحاظ۔ نہ جائز کا امتیاز ہوتا ہے نہ ناجائز کا۔ جائز وہ جس سے اپنی قوم کا فائدہ ہو اور ناجائز وہ جس سے اس کا نقصان ہو۔ لہٰذا اس سیاست کا مقصد "تغیرِ تن" ہوتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرا تصور یہ ہے کہ انسان صرف اپنے طبیعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے۔ جسے اس کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ انسان کا مقصد اس ذات کی نشوونما ہے۔ یہ ذات (انسان کی طبیعی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اسے حیاتِ اُخروی کہا جاتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے قوانین (طبیعی) مقرر ہیں اسی طرح اس کی ذات کے لئے بھی قوانین ہیں وہ بھی غیر متبدل اصولِ حیات یا مستقل اقدار کہلاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ انسانی ذات کو "تن" کے مقابلہ میں "جان" کہکر بھی پکارتے ہیں۔ حکمت کلیمی کی غایت، تغیرِ جان (یعنی انسانی ذات کی نشوونما ہوتا ہے۔ اس میں تغیرِ تن، مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ تغیرِ جان کا ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن حکمتِ فرعونی میں چونکہ تغیرِ ذات کا تصور ہی نہیں ہوتا اس لئے اس کا نتیجہ ہوتا ہے ۔۔ تخریبِ جان، تغیرِ تن ۔۔ اور اس کے لئے جو مکر و فریب بھی ضروری سمجھا جائے روا رکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ دنیا جہنم بن جاتی ہے۔ جیسا کہ آج کل عملاً یہاں طور پر ہو رہا ہے۔ اس سیاست کی خصوصیت یہ ہے کہ

حکمتے از بندِ دیں آزادۂ ۔۔۔ از مقامِ شوق دُور افتادۂ

دین نام ہے ان مستقل اقدارِ حیات کا جو وحی کی رو سے ملتی ہیں۔ اس سیاست میں ان حدود و قیود کا کوئی لحاظ ہی نہیں رکھا جاتا۔ یہ یا تو وحی کو تسلیم ہی نہیں کرتی (جیسا کہ کمیونزم میں ہے) اور یا اگر تسلیم کرتی ہے تو اسے پرستش گاہوں کی چاردیواری کے اندر محدود رکھتی ہے۔ عملی کاروبارِ حیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا (جیسا کہ عیسائی دنیا میں ہو رہا ہے ۔۔ اور عیسائی دنیا میں کیا اب تو ساری دنیا میں اسی انداز زندگی کا دور دورہ ہے) نتیجہ ان دونوں کا ایک ہے۔ دونوں ہی "حکمتِ فرعونی" پر مبنی ہیں۔ وہاں کی کمیونزم ہو یا مغرب کی جمہوریت۔ دین کے نقطۂ نگاہ سے دونوں مردود و ملعون ہیں۔

اس حکمت (سیاست) کا مدار، استعماریت پر ہوتا ہے۔ یعنی کمزور اقوام کو مغلوب رکھ کر انہیں اپنے مفاد کا آلۂ کار بنانا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے قوم غالب کرتی یہ ہے کہ قومِ مغلوب کے بچوں کی تعلیم کا نظام اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

مکتب از تدبیرِ او گیرد نظام ۔۔۔ تا بکامِ خواجہ اندیشہ غلام

اس تعلیم سے اس محکوم قوم کے "تعلیم یافتہ" طبقہ کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی

اس کے بعد، اس قوم غالب کی اسکیم یہ ہوتی ہے کہ یہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے اور وہ ان کی مرضی و منشا کے

مطابق دین کی تاویلیں کرکے، عوام کو ان کی اطاعت و فرماں برداری کی افیون گھول گھول کر پلاتے رہتے ہیں۔

شیخ ملت با حدیث دلنشیں　　　بر مراد او کند تجدید دیں

یہ مذہبی پیشوا اتنا ہی نہیں کرتے کہ عوام کو قوم حاکم کی اطاعت پر مائل رکھتے ہیں، یہ فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں سے قوم کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔

از دم او وحدت قومے دو نیم　　　کس حریفش نیست جز چوب کلیم

ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی ڈنڈے والا آئے اور انہیں سیدھا کرے۔

وائے قومے کشتۂ تدبیر غیر　　　کار او تخریب خود، تعمیر غیر

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم اپنی تخریب کرتی رہتی ہے اور قوم غالب کی تعمیر۔ کس قدر بدبختی ہے اس قوم کی!

می شود در علم و فن صاحب نظر　　　از وجود خود نگردد با خبر

اس میں شبہ نہیں کہ اس قوم میں علم و فن کی کمی نہیں رہتی ــــ اس میں بڑے بڑے انجینئر۔ بڑے بڑے ڈاکٹر۔ اچھے اچھے ٹیکنیشنز پیدا ہو جاتے ہیں لیکن یہ صرف قوم حاکم کی مشینری کے کل پرزے بنتے ہیں۔ اپنے ملی وجود سے یکسر بیگانہ اور بے خبر رہتے ہیں۔

نقش حق را از نگین خود سترد　　　در ضمیرش آرزوہا زاد و مرد

چونکہ یہ اس قوم کی مشینری کے کل پرزے بنتے ہیں جس کی سیاست خالص فرعونی ہوتی ہے، اس لئے ان کے دل میں بھی حق و صداقت کا کوئی احترام نہیں رہتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ان کے افسر جو کام ان کے سپرد کر دیں یہ میکانکی طور پر اسے سرانجام دے دیں گے لیکن ان کے اپنے دل میں اول تو کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوگی اور اگر پیدا ہوگی تو وہیں مر جائے گی۔ آہستہ آہستہ اس قوم کے افراد کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

بے نصیب آمد اولاد غیور　　　جان بتن چو مردہ در خاک گور

یہ خود جیتے جاگتے انسان نہیں، بلکہ چلتی پھرتی لاشیں بن جاتے ہیں۔ اپنی حالت یہ ہو جاتی ہے اور ان کی اولاد کی کیفیت یہ کہ غلط تربیت و تعلیم سے ان میں غیرت و حمیت کی رمق تک باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا اس قوم کی موجودہ نسل بھی تباہ ہو جاتی ہے اور آنے والی نسلیں بھی برباد۔

از حیا بیگانہ پیران کہن　　　نوجواناں، چوں زناں مشغول تن

قوم کے نوجوانوں کی یہ حالت کہ وہ عورتوں کی طرح اپنے بناؤ سنگھار میں لگے رہتے ہیں اس لئے ان کے سامنے جسم کی پرورش اور تزئین و آرائش سے بلند کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا۔ یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کے نوجوانوں کی۔ باقی رہے ان کے بڑے بوڑھے تو چونکہ وہ بھی اسی تعلیم کے تیار کردہ ہوتے ہیں اس لئے ان میں حیا اور غیرت ہی نہیں ہوتی ــــ ایک کی بیوی دوسرے کی بہار آغوش۔ ایک

کی زندگی دوسروں کی آرائشِ محفل۔

در دلِ شان آرزوہا بے ثبات — مردہ زایند از بطونِ اُمہات

چونکہ ان کے سامنے اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے علاوہ کوئی نصب العین نہیں ہوتا اس لئے ان کے دل میں آرزوئیں بھی ہنگامی اور عارضی ہوتی ہیں۔ یہ زندگی کے حامل انسان نہیں ہوتے۔ یوں سمجھو جیسے عورت کے پیٹ سے مردہ بچہ پیدا ہوا ہو۔ دیکھنے میں بالکل انسان لیکن زندگی سے عاری!

دخترانِ اُو بہ زُلفِ خود اسیر — شوخ چشم و خودنما و خردہ گیر
ساختہ۔ پرداختہ۔ دل باختہ — ابروان مثلِ دو تیغِ آختہ!
ساعدِ سیمینِ شان عیشِ نظر — سینۂ ماہی بموج اندر نگر

یہ تو تھے اس قوم کے نوجوان لڑکے۔ اس کی لڑکیوں کی حالت ان سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ ان کے ذہن میں ان کی زندگی (بلکہ پیدائش) کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ یہ اس کا کھلونا ہیں۔ اس لئے ان کی ساری کوشش اسی میں صرف ہو جاتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مردوں کی نگاہ میں زیادہ سے زیادہ جاذب بن کر دکھائی دیں۔ وہ ہر وقت سجنے سنورنے میں لگی رہتی ہیں۔ نمائشِ خویش کا جذبہ ان کے دل میں انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ یہی جذبہ ہے جو انہیں اس قسم کا لباس زیب تن کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جس سے جسم عُریاں ہو کر سامنے آجائے۔

یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جو لا دین سیاست کے نظامِ تعلیم و تربیت کی پیداوار ہوں اس سے اس قوم کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

ملّتے خاکستر او بے شرر — صبحِ او از شامِ او تاریک تر

وہ قوم راکھ کا ایسا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے جس میں زندگی کی کوئی چنگاری تک باقی نہیں رہتی۔ اس کی صبح اس کی شام سے بھی زیادہ تاریک ہوتی ہے۔ اس کا حال بھی تباہ ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔

ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ — کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

ان کی ساری تگ و تاز "روٹی" کی نذر ہو جاتی ہے۔ معاشی پریشانیاں انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیتیں۔ صبح سے شام تک فکرِ معاش، اور ہر وقت موت کا ڈر ان کے اعصاب پر سوار۔ جب زندگی کے بلند مقاصد سامنے ہوں تو موت، انسان کے لئے درخشندہ تر مستقبل کا دروازہ بن جاتی ہے۔ لیکن جب روٹی کی فکر ہمیشہ دامنگیر رہے تو اسے ہر وقت یہ پریشانی رہتی ہے کہ اگر میری موت واقع ہو گئی تو میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا بنے گا؟ یہ کہاں سے کھائیں گے۔ یہ کیسے زندہ رہیں گے؟ اسی طرح انسان کی ساری عمر فکرِ معاش اور ترسِ مرگ میں گزر جاتی ہے۔

یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کے غریب یا متوسط طبقے کی۔ باقی رہے اس کے خوش حال لوگ۔ سو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

منعمانِ او بتجمل عیش دوست　　　　غافل از مغز اند و اندر بند پوست

وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں اور تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ دولت، زندگی کے بلند مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن ان کے نزدیک یہ بجائے خویش مقصودِ حیات بن جاتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ تنہا دولت سے آپ زندگی کے ظواہر کو خرید سکتے ہیں اس کے باطن کو نہیں سنوار سکتے۔ اور "باطن" (انسانی ذات کی نشوونما) چونکہ لادین معاشرہ کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہی نہیں، اس لئے اس قوم کے دولت مند طبقہ کی ساری عمر، جسم اور اس کے لوازمات کے مرکز کے گرد گردش کرنے میں ضائع ہو جاتی ہے۔

المختصر اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

قوتِ فرماں روا معبودِ او　　　　در زیانِ دین و ایماں سودِ او

وہ ہمیشہ قومِ غالب کی پرستش کرتی رہتی ہے۔ وہی ان کا معبود ہوتی ہے اور اسی کی اطاعت، ان کی عبادت، وہ اپنے دین اور ایمان کو بیچ کر، دنیاوی مفاد حاصل کرتی ہے۔ اور اسے بڑا نفع کا سودا سمجھتی ہے!

از خدا مرد ز خود، بیروں نجست　　　　روزگارش نقشِ یک فردا نبست

ان کی نگاہ ہمیشہ پیش پا افتادہ مفاد پر رہتی ہے اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ ان کی نظروں میں مستقبل ہوتا ہی نہیں

از نیاگاں دفترے اندر بغل　　　　الاماں از گفتہ ہائے بے عمل

وہ اپنے ماضی کے زریں کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو فریبِ نفس میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اسلاف کی کتابیں بغل میں دبائے، وہ سمجھتے ہیں کہ بس ساری دنیا کا علم ان کے قبضے میں ہے۔ وہ ان کے اقوال کو دنیائے تحقیق و تدقیق میں حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ اور ان کی اندھی تقلید میں فلاح و فوز کا راز۔ وہ ساری عمر دوسروں کو وعظ و تلقین کرتے رہتے ہیں، لیکن جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے۔

دینِ او عہدِ وفا بستن بہ غیر　　　　یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

اپنوں سے کٹ کر، دوسروں کے ساتھ ملنا، ان کا دین ہوتا ہے۔ وہ کعبہ کی اینٹوں سے کلیسا کی تعمیر کرتے ہیں۔

آہ قومے دل ز حق پرداختہ
مرد و مرگِ خویش را نشناختہ

کس قدر تباہ حال ہوتی ہے یہ قوم جو دینِ خداوندی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے، اور یوں زندگی اور اس کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور تماشا یہ کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس پر موت طاری ہو چکی ہے۔ وہ اپنے آپ کو زندہ قوم سمجھتی ہے اور اس

فریب میں مبتلا رہ کر دن گزار لیتی ہے۔ یہ عدمِ احساس سب سے بڑا نقصان ہے جو کسی قوم کو پہنچ سکتا ہے۔

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا ۔۔۔ وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

حکمتِ کلیمی اور حکمتِ فرعونی کی اس تمہیدی وضاحت کے بعد حضرت علامہؒ، اس اساس و بنیاد کی طرف آتے ہیں جس پر دین کے نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی لا الٰہ - الا اللہ۔

دنیا میں جب کوئی قوم اپنے شعور کی آنکھ کھولتی ہے تو وہ اپنے گرد و پیش مختلف قوتوں کو کارفرما دیکھتی ہے۔ حکمران طبقہ کی قوت۔ دولت کی قوت۔ مذہبی پیشوائیت کی قوت۔ معاشرہ کے رسوم و رواج کی قوت۔ اسلاف کی اندھی عقیدت کی قوت۔ اگر وہ قوم ان قوتوں میں سے کسی ایک قوت کے بھی تابع فرمان رہتی ہے تو وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتی۔ آزادی کا تقاضا ہے کہ وہ ان تمام بندھنوں کو ایک ایک کر کے توڑے۔ اسے کہتے ہیں لا الٰہ۔ یعنی دنیا میں کوئی ایسی قوت نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ جس کی اطاعت اور محکومی اختیار کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ان بندھنوں کو توڑنے اور ان قوتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے، بڑی ہمت اور قوت کی ضرورت ہے۔ اس میں ان سے ٹکراؤ ہوگا۔ تصادم ہوگا۔ تزاحم ہوگا۔

اب فرض کیجئے کہ ایک قوم پیہم تصادمات اور مسلسل سپاہیانہ تگ و تاز سے ان قوتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہے، تو کیا یہ سمجھ لیا جائے گا کہ اسے اپنا مقصودِ حیات حاصل ہو گیا؟ بالکل نہیں۔ زندگی ایک نظام چاہتی ہے اور نظام لازم ہے اپنے آپ کو قواعد و ضوابط کے تابع رکھنے کا۔ اس لئے اس قوم کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو قوانین کے تابع لائے۔ لیکن کس کے قوانین کے؟ صرف خدا کے قوانین کے جنہیں اس نے وحی کے ذریعے عطا کیا ہے اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اسے کہتے ہیں۔ اِلَّا اللّٰہ ــــ یعنی دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے وضع کردہ آئین و قوانین کے سامنے جھکا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زندگی لاقانونیت کی بسر کی جائے۔ صحیح نظامِ زندگی یہ ہے کہ انسان اللہ کے قوانین کے سامنے جھکے۔ اس سے اسے صحیح ثبات و سکون حاصل ہوگا۔

پہلا مرحلہ تخریب کا تھا۔ دوسرا تعمیر کا ہے۔ پہلا مرحلہ ان تمام عمارات کو گرانے کا تقاضا جو اس قوم کے معاشرہ کی زمین پر پہلے سے قائم تھیں۔ جب زمین اس طرح ہموار ہو جائے تو پھر دوسرا حصہ اس زمین پر، خدا کے عطا کردہ نقشے کے مطابق عمارت کو استوار کرنے کا آتا ہے یہ ہے مطلب ــــ لا الٰہ الا اللہ کا ــــ پیشِ نظر عنوان میں حضرت علامہؒ نے اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

نکتۂ می گویم از مردانِ حال ۔۔۔ امتاں را لا جلال ۔ اِلّا جمال

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ پہلا مرحلہ تصادم اور تزاحم کا ہوتا ہے جس میں بڑی قوت اور قہاری کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ مرحلہ "جلال" کا ہے۔ اس کے بعد حسن کارانہ انداز سے تعمیر کا پروگرام سامنے آتا ہے یہ مرحلہ "جمال" کا ہے۔ جلال اور جمال دونوں کے امتزاج سے حُسن پیدا ہوتا ہے۔ اس پروگرام کا نام "ایمان اور اعمالِ صالح" ہے۔ دنیا سے ہر باطل کے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ حق کے نظام کا قیام۔ اسی میں قوموں کی صحیح زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

لا و الا احتساب کائنات لا و الا فتح باب کائنات

ساری کائنات میں لا و الا کا نظام کار فرما ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس سے یہ پرکھا جا سکتا ہے کہ اشیائے کائنات اپنی صحیح روش پر جا رہی ہیں یا نہیں۔ جب بیج زمین میں ڈال دیا جاتا ہے تو فطرت کی مختلف قوتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اس بیج کو سجا کر رکھ دیں۔ یہ لا کا مرحلہ ہے اگر بیج اسی مرحلہ میں رہ جائے تو اس کا نتیجہ تخریب ہوگا لیکن جب اس بیج میں سے کونپل پھوٹتی ہے تو یہ الا (تعمیر) کے مرحلے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سے ایک نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ اس سے کامرانیوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ یہی اصولِ حیات کو قوموں کی زندگی میں بھی عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ اس سے وہ زندہ رہ سکتی اور آگے بڑھ سکتی ہیں۔

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون حرکت از لا زاید - از الا سکون

یہ دونوں قوتیں مل کر کائنات کو اس کی منزل کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہیں۔ پہلے مرحلہ میں وہ سرتاپا حرکت ہوتی ہے دوسرے میں وہ نظام کی پابند ہو کر سکون حاصل کر لیتی ہے۔ یاد رکھیئے دوسرے مرحلہ میں پہنچکر بھی وہ ساکن نہیں ہو جاتی۔ ساکن ہو جانے اور سکون حاصل ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے مرحلہ میں بھی وہ ہر وقت مصروفِ عمل رہتی ہے لیکن یہ عمل تعمیر کے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا حاصل وہ حقیقی اطمینان ہوتا ہے جو حصولِ مقاصد کا فطری نتیجہ ہے۔

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک کوئی قوم اس حقیقت کو نہ سمجھ لے کہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جس کی اطاعت کی جائے، وہ غیر خدائی قوتوں کے بندھنوں کو توڑ نہیں سکتی اور جب تک ان بندھنوں کو نہ توڑ دے، اسے حقیقی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

جو لوگ دنیا میں نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنا چاہیں ان کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ہر غیر خدائی قوت کی اطاعت سے انکار کریں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، نظامِ خداوندی قائم نہیں ہو سکے گا۔

ملتے کز سوز او یک دم تپید از گلِ خود خویش را باز آفرید

جب قوم نے غیر خدائی قوتوں سے منہ موڑ لیا، اس نے اپنی بازآفرینی کی طرف پہلا قدم اٹھا لیا۔ یہیں اس کی نشاۃِ ثانیہ کا حرف

آغاز ہے۔

پیش غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات

زندگی کی علامت یہ ہے کہ ہر غیر خدائی قوت سے برملا کہہ دیا جائے کہ ہم تمہاری اطاعت کے لئے تیار نہیں۔ ہم تمہاری حکمرانی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ جو ایسا کہنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہے وہی دنیا میں صحیح انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

از جنونش ہر گریباں چاک نیست — در خور ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس اعلان کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی ہمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن جسے یہ ہمت میسر آ جائے اس کے انقلاب آفریں کارنامے، ہر کہنہ نظام کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔

جذبۂ او در دل یک زندہ مرد — می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

اس کا کہکشاں گیر ہاتھ اٹھتا ہے اور استبداد کی مسندوں پر بیٹھنے والوں کو، خاک نشین بنا دیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ ایک پیغام دیتے ہیں اور وہ یہ کہ

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز
تخم لا در مشت خاک او بریز

اگر تم چاہتے ہو کہ محکوم اور مظلوم قوم مستبد حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کو یہ تعلیم دی جائے کہ دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو اپنا محکوم بنائے۔ جب یہ تعلیم ان کے دل میں اچھی طرح جاگزیں ہو جائے گی تو پھر وہ کسی کی محکومیت کو گوارا نہیں کر سکتے۔

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر — ہولش از ہول قیامت بیشتر

جس قوم کے دل میں یہ نظریہ اچھی طرح جاگزیں ہو جائے اس سے دنیا کی ہر مستبد قوت کو ڈرنا چاہیئے۔ ایسی قوم دنیا میں قیامت برپا کر سکتی ہے اور کوئی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔

لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے — ایں غو رعد است نے آواز نے

ایسی قوم ہر بالا دست قوت کو شکست دے سکتی ہے۔ کوئی اس کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس کے نعرۂ انقلاب میں بجلی کی سی کڑک اور بادل کی سی گرج ہوتی ہے جو فضائے کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتی ہے۔

ضرب او ہر بود را سازد نبود — تا بروں آئی ز گرداب وجود

اس کی ضرب ہر اس شخص یا گروہ کو جو دوسروں پر حکمرانی کرنے کا مدعی ہو، ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس طرح دنیا میں کوئی قوت ایسی باقی نہیں رہتی جس کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ جب لا کا یہ مرحلہ اس طرح طے ہو جائے تو پھر خدا

کی حکومت کے قیام کے لئے زمین ہموار ہو جاتی ہے اور دنیا میں صرف ان کی حکمرانی باقی رہ جاتی ہے۔ اس طرح لَا اور اِلَّا کے امتزاج سے ایک نئی دنیا وجود میں آ جاتی ہے۔ جس میں ہر مقام پر حق غالب ہوتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ نے بتایا ہے کہ چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین میں کس طرح اس تعلیم کو پھیلایا گیا اور اس صحرا نشین قوم نے کس طرح دنیا کی باطل تہذیبوں کی بساط الٹ کر ان کی جگہ ایک نئی تہذیب کی طرح ڈال دی۔ اس حصے کو آیندہ قسط میں بیان کیا جائے گا۔

جس طرح
تاج محل
آج بھی اسی طرح تروتازہ اور
شگفتہ و شاداب ہے
جس طرح آج سے تین سو سال پہلے تھا
اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ جاوید
ہوا کرتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب
محترم پرویز صاحب کی
تصنیف

سلیم کے نام خطوط

ہے۔ جوں جوں دن گزرتے ہیں اس کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

سلیم کے نام خطوط (تین خوبصورت جلدوں میں)

جلد اول ——— ۸ روپے

جلد دوم ——— ۶ روپے

جلد سوم ——— ۶ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

قرآن اور حدیث

علامہ السید احمد السیفی

ترجمہ: سید نصیر شاہ۔ میانوالی

[حدیث کے متعلق طلوع اسلام کے مسلک سے قارئین اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کا ملخص یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کو نہ خود مرتب فرمایا (جمع اور مدون کرا کر امت کو دیا) نہ ہی خلفائے راشدینؓ یا دیگر صحابہ کبارؓ نے ایسا کیا۔ حضورؐ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد بعض حضرات نے اپنے ذوق کی رُو سے انفرادی طور پر احادیث کو جمع اور مرتب کیا۔ چونکہ یہ انفرادی کوششیں تھیں اس لئے اس میں سہو و خطا کا امکان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں ضعیف اور وضعی حدیثیں بھی شامل ہو گئی ہیں جن کا اسلام اور خود نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر بڑا معتر اثر پڑتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسی احادیث کو ان مجموعوں سے نکال دیا جائے۔ اس کے لئے معیار یہ ہونا چاہیئے کہ جو حدیث قرآن کریم کے خلاف ہو یا اس سے حضورؐ کی شان یا صحابہ کبارؓ کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو انہیں غلط قرار دیا جائے۔ یہی ہے ہمارا وہ جرم جس کی بنا پر ہمیں منکر حدیث قرار دیا جاتا ہے۔

مصر کے مولانا السیفی کے دو تین مضامین اس سے پہلے قارئین کی نظروں سے گزر چکے ہیں ذیل میں ان کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا ہے جس سے واضح ہوگا کہ حدیث کے بارے میں ان کا مسلک کیا ہے۔ طلوع اسلام]

اگرچہ حضور سرورِ کائنات صلعم نے حدیث کی کتابت سے صحابہؓ کو منع فرما دیا تھا لیکن اعصار و دہور کی پُرپیچ راہوں میں پیش آنے والے واقعات آپؐ کی دوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ آپ کو علم تھا کہ نبی کی وفات کے بعد کس طرح امت اس کے افعال و اقوال کی جستجو میں مضطرب و بے قرار ہو کر نکلتی ہے اور ہر اس چیز کو بلا تحقیق قبول کر لیتی ہے جو اس عظیم رہنما سے منسوب ہو۔ عقیدت مندوں کی نیاز کیش آنکھیں نسبت کی تقدیس کو دیکھ کر جھک جاتی ہیں۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون سے فعل اور کون سے قول کو اس ذات اقدس و اعظم سے نسبت دی جا رہی ہے۔ یہ دور، دورِ اضطراب ہوتا ہے۔ ارادت مند گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اپنے محبوب رہنما کے اقوال و افعال اور احوال کی تلاش میں سراسیمگی سے لپکتے ہیں اور جو رطب و یابس بھی ملتا ہے اسے نیاز کی آنکھوں سے دیکھتے اور عقیدت کے ہونٹوں سے چومتے ہیں۔ اس دورِ اضطراب میں فساد پسند طبیعتوں کی بن آتی ہے وہ کئی گمراہ کن اقوال اپنی طرف سے گھڑ کر مرنے والے کی شخصیت سے منسوب کر دیتے ہیں۔ بُت پرست ذہنوں کو بھی موقع مل جاتا ہے۔ وہ عجیب و غریب افسانے تراشتے ہیں۔ قسم قسم کی کرامات گھڑتے ہیں اور مرنے والے کا نام ان پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ خود مجھے بھی اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں مجھے مشرق کے مشہور شاعر اور عالم اسلام کے بلند پایہ مفکر جناب علامہ اقبالؒ کے فارسی کلام کے مطالعہ کا موقع نصیب ہوا۔ فارسی پر اگرچہ مجھے کچھ زیادہ دسترس نہیں تھی لیکن جناب علامہؒ کا کلام بڑا نکھرا ہوا اور سلیس تھا اس لئے طبیعت بہت متاثر ہوئی اور مطالب بہت آسانی سے ذہن میں گھر کر گئے۔ مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے تو مسکرا لیتا ہوں۔ واللہ عجیب طرح کا جنون تھا۔ جو مجھ پر سوار ہو گیا تھا اور اس جنون کا یہ مطالبہ نہ تھا کہ میں اردو اور فارسی میں اچھی دستگاہ حاصل کر کے اس شخصیتِ عظمیٰ کے پیغام سے واقف ہو جاؤں۔ بلکہ اس وحشت کا یہ تقاضا تھا کہ کبھی مجھے کوئی ایسا موقع نصیب ہو کہ ان کے کسی ملاقاتی سے شرفِ صحبت حاصل ہو۔ اور میں ان کے حالات سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کروں۔ یہ جذبہ بھی بڑا مبارک تھا۔ مگر بدقسمتی سے ملاقات ہوئی تو ایک ایسے شخص سے جس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حضرت علامہ بڑے صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ "میں عرصہ دراز تک علامہؒ صاحب کے پاس بیٹھتا رہا ہوں" پھر انہوں نے عجیب و غریب کرامات ان سے منسوب کیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا کہ بعض لوگ علامہؒ صاحب کے پاس سونا بنانے کا فن سیکھنے بھی آتے۔ کیونکہ علامہؒ صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کیمیا گر ہیں۔ پھر ان حضرت نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے بتایا کہ جب لوگ سونا سازی سیکھنے آئے تو حضرت علامہ نے فرمایا مجھے تو عام کیمیا گروں کی ترکیبیں نہیں آتیں۔ میرے اللہ نے مجھے تو یہ کرامت عطا فرمائی ہے کہ میری آہ جس مٹی پر پڑتی ہے اسے سونا بنا دیتی ہے۔ پھر انہوں نے اردو کا کوئی اس قسم کا شعر بھی پڑھا تھا جس میں علامہ صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس آہِ آتشیں کے سوا کوئی کیمیا نہیں[1]۔ اس طرح وہ عظیم فیلسوف کو مداری ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے اور میں مسکراتا رہا۔ سوچتا ہوں کہ اگر مجھے اللہ

---

[1] غالباً سیفی صاحب کے سامنے ان کے ملنے والے نے علامہ اقبالؒ کا یہ شعر پڑھا ہو گا۔

سہ مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں ۔۔۔ یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے (نصیر شاہ)

نے ذہنِ سلیم عطا نہ کیا ہوتا تو میں بھی اپنے دوست عزیز بگ[1] کی طرح ان حالات کو قلم بند کر کے سیاہی اور کاغذ کا بہت بڑا ذخیرہ خراب کر کے چھپوا دیتا اور علامہ مشرقی کو مدارج ثابت کر کے نہ صرف ان پر بلکہ علمی دنیا پر بھی ظلم عظیم کر بیٹھتا۔ اور ہاں آپ کی آنکھوں نے بھی تو بارہا یہ مناظر دیکھے ہوں گے کہ کس طرح بعض لوگ پاؤں کا کوئی نشان لے کر قریہ قریہ گھومتے ہیں اور دنیا فرطِ عقیدت سے سر جھکا لیتی ہے اور کس طرح کچھ آدمی چند بال اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں اور بے چارے عوام محض ان کا دیکھ لینا دینوی و اُخروی سعادت سمجھتے ہیں یہ سب کچھ محض اس لئے ہوتا ہے کہ پیشہ ور لوگ پاؤں کے اس نشان اور ان چند بالوں کو پیغمبرِ انسانیت صلعم سے منسوب کرتے ہیں۔ خیر یہ باتیں توضمناً اور برسبیلِ تذکرہ چھڑ گئی تھیں۔ ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ عقیدت و ارادت کے قلم اٹھا کر چلنے والے ہر اس قول و فعل کو بے سوچے سمجھے لکھ لیتے ہیں جو ان کے عظیم راہبر سے منسوب ہو۔ ان اقوال و افعال میں چونکہ مفسدہ پردازوں کی فساد انگیزیاں سننے والوں کا اخذ کردہ مفہوم اور عجائب پسند ذہنوں کی رنگ آمیزیاں شامل ہو جاتی ہیں اس لئے بعد میں ضلالت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اقوال و افعال کے ان انباروں میں اس شخصیت کا عظیم پیغام دب جاتا ہے۔ اس طرح نادان دوست چند سالوں میں وہ کام کر بیٹھتے ہیں جو دانا دشمن صدیوں میں نہ کر پاتے۔

عقیدت میں ڈوبے ہوئے قلم کی کوتاہ اندیشیاں دیکھنی ہوں تو بائیبل کو اٹھا لیجئے اور دیکھئے کہ دشمنوں کی نوکِ نشتر سے نہیں بلکہ دوستوں کی نوکِ قلم سے نوحؑ[2] و ابراہیمؑ[3] کے پاکیزہ دامن کس طرح تار تار کئے گئے ہیں۔ یہ دشمنوں کی اچھالی ہوئی کیچڑ نہیں، بلکہ عقیدت مندوں کے برسائے ہوئے پھول ہی تو ہیں جنہوں نے یوسفؑ علیہ السلام پر الزامات عائد کئے ہیں۔ اور ہارونؑ[4] اور سلیمانؑ[5] کو شرک کا مرتکب ٹھہرایا۔ اور یہ موسیٰؑ کے ارادت مند ہی تو تھے جنہوں نے توراتؑ[6] میں لکھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ان کی بہن نے ان کی کوشی بی بی کے متعلق الزام عائد کیا تھا۔ ان لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی ذاتِ گرامی پر تو ایسا بہتان باندھا ہے کہ اسے نقل کرتے ہوئے قلم لرزتا ہے اور دل کانپ اٹھتا ہے۔

---

[1] میرے دوست عزیز بگ نے اپنی حالات کو قلم بند کر کے مصر کے ایک معروف رسالہ میں شائع کرا دیا تھا۔ (سیلی)

[2] بائیبل کتاب پیدائش ۹ ۔ [3] بائیبل کتاب پیدائش ۱۲ ، ۲۰ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل الشان پیغمبر پر ہماری کتبِ روایات نے بھی یہ الزام لگایا کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے تھے۔ (بخاری شریف) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صراحت اور خصوصیت کے ساتھ فرمایا تھا وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۝ (اور کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کہ بیشک وہ سچے نبی تھے) دوسرے انبیاء پر بھی بہتان تراشیاں کی گئی ہیں اور بخاری و مسلم کی شفاعتِ کبریٰ والی روایت نے تو آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ جیسے عظیم انبیاء کی فردِ قرارداد جرم مرتب کر دی ہے (معاذ اللہ) اور کہا ہے کہ چونکہ ان حضرات نے دنیا کی زندگی میں کچھ خطائیں کی تھیں اس لئے شفاعت کرنے سے شرماتے تھے۔ [4] پیدائش ۳۲ [5] خروج (۳۲) [6] سلاطین (۱۱) [7] گنتی (۱۲)۔

یہ دوست ہی تو تھے جن کی ناعاقبت اندیشیوں نے عقیدت میں ڈوبے ہوئے قلم سے یہ زہر ٹپکایا کہ لوط علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے باپ کی نسل باقی رکھنے کی غرض سے انہیں شراب پلائی ایک رات پہلوٹھی بیٹی اندر گئی اور لوط نے اس سے بدکاری کی (معاذ اللہ) اور دوسری رات اسی طرح شراب پلا کر دوسری بیٹی ان کے پاس گئی۔ ہاں یہ دوست ہی تھے جنہوں نے اسحٰق علیہ السلام کے دامن پر بے خیالی میں گندگی کے چھینٹے پھینکے اور یعقوب علیہ السلام کو راحیل پر عاشق ٹھہرا کر اس قدر فحش قصہ لکھا کہ اسے نقل کرنے کی بھی مجھے ہمت نہیں۔ اسی طرح کا ایک ناپاک قصہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بھی تورات میں درج ہے اناجیل کو بھی دیکھئے کس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ثابت کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئی ہیں۔

غرضیکہ پچھلے انبیا کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا وہ حضور سرورِ کائنات سے پوشیدہ نہ تھا اس لئے آپ نے انتہائی احتیاط سے کام لیا اور کتابتِ حدیث سے منع کرنے کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دے دیا کہ جو قول یا فعل میری طرف منسوب کیا جائے اسے کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھ لیا کرو۔ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو اسے قبول کر لو اگر مخالف ہو تو اسے رد کر دو۔ آپ کا یہ ارشاد متعدد روایات میں ملتا ہے۔

حضرت ابو جعفر سے روایت ہے۔

عن رسول اللہ صلعم قال سألت الیھود عن موسیٰ فاکثروا وزادوا ونقصوا حتی کفروا وسألت النصاریٰ عن عیسیٰ فاکثروا فیہ وزادوا ونقصوا حتی کفروا بہ ، وستفشو عنی احادیث فما اتاکم من حدیثی فاقرؤا کتاب اللہ فاعتبروہ فما وافق کتاب اللہ فانا قلتہ وما لم یوافق کتاب اللہ فلم اقلہ (مدخل البیہقی)

رسولِ خدا صلعم نے فرمایا۔ میں نے یہودیوں سے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق دریافت کیا انہوں

۹؎ پیدائش ۱۹/۳۱-۳۸ ۱۰؎ پیدائش باب ۴۰، ۲۶/۱۱-۲ ۱۱؎ پیدائش ۳۷/۱-۳۰ ، ۲۹/۱۱-۲۹ ، باب ۴۳ مکمل۔

۱۲؎ کتاب دوم سموئیل ۱۱/۲-۳ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور تصور میں آپ کے سروں کو بھی دیکھ رہا ہوں جو طنز و فخر کے ملے جلے جذبات سے بلند ہوتے ہیں۔ جب کسی دوسرے مذہب کی خامیاں بیان کی جا رہی ہوں تو ہمارے سر فخر و غرور سے بلند ہو جاتے ہیں مگر میں کہوں گا کہ ان سروں کو طنز یہ و فخریہ انداز میں بلند نہ کیجئے بلکہ شرم و ندامت سے جھکا لیجئے کیونکہ یہ تمام خرافات ہماری کتب روایات میں بھی موجود ہیں یہ تاریخ کا وہ دردانگیز باب ہے جس پر میرا افسردہ قلم کسی اور فرصت میں سینہ کوبی کرے گا۔ زبان جانوں کتاب اللہ کے جن انبیا کے مقدس دامنوں پر انیوں اور بیگانوں کے پھینکے ہوئے داغ دھو ڈالے (سیفی) ۱۳؎ لوقا ۱/۳۵ متی ۱/۱۸ یوحنا ۱/۱ وغیرہ۔

نے اکثر باتوں میں اس قدر کمی بیشی کی کہ کافر ہو گئے اور میں نے عیسائیوں سے عیسیٰؑ کے متعلق پوچھا انہوں نے بھی اقوال میں اس قدر کمی بیشی کی کہ کافر ہوئے اور عنقریب میرے بہت سے اقوال پھیلائے جائیں گے۔ پس میری جو حدیث بھی تمہیں پہنچے اسے کتاب اللہ کے معیار پر پرکھ لیا کرو۔ جو کچھ کتاب اللہ کے موافق ہو تو سمجھ لو کہ یہ میری بات ہے جو کتاب اللہ کے موافق نہ ہو سمجھ لو کہ میری بات نہیں۔

اس حدیث کے راوی ہیں محمدؒ بن علیؒ بن الحسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب، ان کی کنیت ابوجعفر المدنی ہے۔ امام باقرؒ بھی انہیں کو کہا جاتا ہے، یہ اپنے والدؒ ابوسعیدؓ، جابرؓ، ابن عمرؓ اور دیگر صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے ان کے فرزند جعفر، امام زہری، مخول بن راشد اور اکثر لوگ روایت کرتے ہیں۔ صحاح ستہ میں ان کی روایات موجود ہیں ان کے متعلق ابن سعد لکھتے ہیں۔

ھو ثقۃ کثیر الحدیث (طبقات ابن سعد)

وہ ثقہ اور کثیر الروایت ہیں۔

محمد بن المنکدر کا قول ہے کہ

ما رأیت احدا الفضل علی علی بن الحسینؓ حتی رأیت ابنہ محمدا

(الرد علی سیر الاوزاعی ص۲۵)

میں نے علم و فضل میں حضرت علی بن الحسینؓ سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا سوائے ان کے فرزند محمدؒ کے۔

اسی روایت کو فقہ حنفی کے مشہور امام جناب قاضی ابویوسفؒ صاحب نے بھی ایک ضمنی واقعہ کے تحت لکھا ہے۔

ضمنی واقعہ امام اعظمؒ کا قول تھا کہ

الرجل یموت فی دار الحرب او یقتل لا یضرب لہ بسھم فی الغنیمۃ (ایضاً ص۲۳)

جو شخص دار الحرب میں وفات پائے یا قتل ہو جائے مالِ غنیمت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

امام اوزاعیؒ اس کے مخالف ہیں۔ وہ امام اعظمؒ کے محولہ بالا قول کے رد میں ایک روایت پیش کرتے ہیں۔

اسھم رسول اللہ صلعم لرجل من المسلمین قتل بخیبر فاجمعت الائمۃ الھدیٰ علی الاسھام لمن مات او قتل (ایضاً ص۲۳)

رسول اللہؐ نے مالِ غنیمت میں سے ایک ایسے مسلمان کا حصہ نکالا تھا جو خیبر کی جنگ میں شہید ہوا تھا۔ پس ائمہ کا اجماع ہے کہ جو دار الحرب میں قتل ہو جائے یا مر جائے مالِ غنیمت میں سے اس کا حصہ نکال کر ورثاء کو دیا جائے۔

امام اوزاعیؒ کی پیش کردہ روایات نقل کر کے امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

ما قالہ عن رسول اللّٰہ صلعم فھو کما قال ولرسول اللّٰہ صلعم فی النفل و غیرہ حال لیست لغیرہ وقد اسھم رسول اللّٰہ صلعم لعثمانؓ بن عفان فی بدر ولم یشھدھا فقال: واجری یارسول اللّٰہ قال: واجرک واسھم ایضا لطلحۃ بن عبید اللّٰہ فی بدر ولم یشھدھا فقال واجری قال واجرک ولو ان اماما من ائمۃ المسلمین اشرک قوما لم یغزوا مع الجند لم یسع ذالک لہ و کان مسئیا فیہ ولیس للائمۃ فی ھذا مالرسول اللّٰہ صلعم (ایضاً ص۲۱)

رسولِ خدا سے جو روایت بیان کی گئی ہے وہ تو جیسی ہے سو ہے۔ اور یہ بات بھی تو ہے کہ نفل وغیرہ میں حضورؐ کا جو طرزِ عمل رہا ہے وہ انہی سے مخصوص تھا۔ آپؐ نے جنگ بدر کے مالِ غنیمت میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان کا حصہ نکالا۔ حالانکہ وہ جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے پس جب انہوں نے کہا کہ "اے اللہ کے رسول میرا حصہ" تو آپؐ نے فرمایا "یہ رہا تمہارا حصہ" اسی طرح آپ نے بدر کے مالِ غنیمت میں سے طلحہؓ بن عبید اللہ کا حصہ بھی نکالا حالانکہ وہ بھی جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ پس جب انہوں نے کہا "میرا حصہ اے خدا کے رسول" تو آپؐ نے فرمایا "یہ رہا تمہارا حصہ" اگر ان واقعات کو دیکھ کر کوئی امیرالمومنین ان لوگوں کو مالِ غنیمت میں شریک کرنے لگے جو جنگ میں شامل نہیں تھے تو یہ قطعاً جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس معاملہ میں ائمۃ المسلمین کے لئے وہ بات جائز نہیں جو رسولِ خدا صلعم سے مخصوص تھی۔

دیکھئے اس جگہ امام یوسفؒ نے کس صراحت کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ جو افعال حضورؐ سے مخصوص تھے ان کی اتباع ہم پر واجب نہیں۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ نے کب فرمایا تھا کہ میں عثمانؓ اور طلحہؓ کے حصے نکال رہا ہوں مگر یہ مجھی سے مخصوص ہیں۔ تم ایسا نہ کرنا۔ فقہا کی یہ چیز ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کہیں تو وہ حضرات حدیث کو قرآن کو منسوخ ٹھہراتے ہیں اور کہیں کہتے ہیں چونکہ یہ فعل حضورؐ سے مخصوص تھا اس لئے اس کی اتباع ہمارے لئے ضروری نہیں۔ خیر سردست ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ یہ ضمنی واقعہ حضرت ابوجعفر کی روایت بیان کے سلسلے میں لکھ دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا الفاظ لکھ کر امام یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر خیبر میں حضورؐ نے کسی مقتول کا حصہ نکالا تو یہ فعل انہی سے مخصوص ہوگا۔ اس لئے ہم اس پر عمل کرنے کے مکلف نہیں دوسرے جو قول بھی حدیثِ رسولؐ کہہ کر بیان کیا جائے ہم

اسے بغیر تحقیق ماننے کو تیار نہیں کیونکہ۔

برسرِ منبر حضورؐ کا اعلان

حدثنا ابن ابی کریمہ[۴۴] عن ابی جعفر عن رسول اللہ صلعم انہ دعا الیہود فسالھم فحدثوہ حتی کذبوا علی عیسٰی علیہ السلام فصعد النبی صلعم المنبر فخطب الناس فقال: ان الحدیث سیفشو عنی فما اتاکم عنی یوافق القرآن فھو عنی وما اتاکم عنی یخالف القرآن فلیس عنی۔ (الرد علی سیر الاوزاعی ص۳۱)

ہمیں ابن کریمہ نے حضرت ابوجعفر کی یہ روایت بتائی کہ نبی صلعم نے یہود کو بلایا اور ان سے دریافت کیا انہوں نے عیسٰی علیہ السلام کے نام پر گھڑے ہوئے جھوٹ بیان کئے اس پر نبی صلعم منبر پر تشریف لائے اور لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ عنقریب مجھ سے منسوب کی ہوئی بہت سی احادیث پھیلائی جائیں گی پس جو حدیث قرآن کے موافق ہو اسے قبول کرلو اور جو کتاب اللہ کے موافق نہ ہو جان لو کہ وہ میری بات نہیں۔

اسی قسم کی ایک اور روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منسوب ہے۔ فرماتے ہیں۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ عن النبی صلعم انہ ستفشو عنی احادیث فما اتاکم من حدیثی فاقرؤا کتاب اللہ واعتبروہ فما وافق کتاب اللہ فانا قلتہ وما لم یوافق کتاب اللہ فلم اقلہ۔

(رواہ الطبرانی فی الکبیر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا میرے بہت سے اقوال پھیلائے جائیں گے پس میری جو حدیث بھی تم تک پہنچے کتاب اللہ سے ملاکر اطمینان کرلو اگر وہ کتاب اللہ کے موافق ہے تو میری بات ہے اور اگر وہ کتاب اللہ کے موافق نہ ہو تو میری بات نہیں۔

---

۴۴ ابن ابی کریمہ سے مراد ابو عبدالرحمٰن خالد بن میسرہ ہیں جو ابن ابی کریمہ اصفہانی کے نام سے معروف تھے۔ پہلے اصفہان میں رہتے تھے پھر کوفہ منتقل ہوگئے۔ تہذیب التہذیب، تاریخ بغداد اور ابو نعیم کی تاریخ اصبہان میں ان کا ذکر موجود ہے۔ معاویہ بن قرۃ، عکرمہ، حضرت ابوجعفر اور عبداللہ بن المسور سے روایت کرتے ہیں۔ احمد، ابوداؤد اور ابن معین نے انہیں ثقہ شمار کیا ہے۔ سفیان، شعبہ، وکیع اور امام یوسف وغیرہ حضرات ان سے روایت کرتے ہیں۔ (سیفی)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلعم نے فرمایا۔

اذا روی لکم الحدیث عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ (بیہقی)

جب میری طرف سے کوئی حدیث بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ پر پیش کرو۔

حضرت علیؓ سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

ان رسول اللہ صلعم قال: اعرضوا حدیثی علی الکتاب فما وافقہ فھو منی وانا قلتہ۔ (ابن عساکر۔ کنز العمال۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر)

رسول خدا صلعم نے فرمایا میری جو حدیث بھی تم تک پہنچے اسے کتاب اللہ کے معیار پر پرکھو۔ پس جو اس کے مطابق ہو وہ میری بات ہے۔

اسی طرح کی ایک اور روایت ہے جس میں کتاب اللہ کی بجائے الحق کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ الحق سے مراد بھی کتاب اللہ ہے۔ روایت ہے۔

اذا حدثتم عنی بحدیث یوافق الحق فصدقوہ وخذوا بہ۔

(مقاصد حسنہ للسبتی وی۔ دار قطنی)

میری جو حدیث بھی تمہیں پہنچے اور وہ الحق کے موافق ہو اس پر عمل کرو اور اس کی تصدیق کرو۔

ابوالوفا لکھتے ہیں۔

وقد روی عن النبی صلعم انہ قال: ما جاءکم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ فما وافق کتاب اللہ فھو عنی وما خالف کتاب اللہ فلیس عنی۔ (حاشیۃ الرد ص۲۷)

نبی صلعم سے روایت ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ مجھ سے منسوب کی ہوئی جو بات تمہیں پہنچے اسے کتاب اللہ کے معیار پر پرکھو۔ پس جو بات کتاب اللہ کے مطابق ہو وہ میری حدیث ہے اور جو اس کے مخالف ہو وہ میری بات نہیں۔

ان احادیث کو غور سے دیکھئے اور سوچئے کہ آپ جو کتاب اللہ کے احکام اور احادیث میں مخالفت پاتے ہیں تو کیا حضورؐ کے قول بلکہ حکم کے مطابق حدیث کو چھوڑ کر کتاب اللہ پر عمل پیرا ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ اس مسئلہ پر صدق دل سے غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ ایسا نہیں کرتے۔ کیونکہ آپ کا تو یہ عقیدہ ہے کہ حدیث

کتاب اللہ کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اس کے مطلق حکم کو مقید کر سکتی ہے۔ اور اس کی تعمیم کی تخصیص بھی کر سکتی ہے۔ میں آپ کو ابدالآباد تک مہلت دیتا ہوں کہ حضورؐ کا کوئی ایسا قول پیش کیجئے جس میں آپؐ نے فرمایا ہو کہ میری حدیث کتاب اللہ پر قاضی ہے اور اس کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہے" اور اگر آپ کوئی ایسی روایت پیش نہ کر سکیں تو خدا کے لئے اپنے گریبان میں جھانک کر تو دیکھئے کہ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے احکام اور خود آقائے انسانیت صلعم کے احکام سے روگردانی نہیں کر رہے ؟ ہم کافر زندیق بھی۔ ہم منکر شانِ نبوت بھی (معاذ اللہ) لیکن آپ جیسے مومن مسلم "بھی ما قدروا اللہ حق قدرہ کے بدنصیب گروہ میں تو شامل نہیں ہو رہے ؟ یہ کچھ سوچئے اور پھر آگے حضور صلعم کے اعلانات سنئے۔

قال حجاج بن المنہال ثنا عبد الوھاب الثقفی سمعت یحییٰ بن سعید قال اخبرنی ابن ابی ملیکہ ان ابن عمیر حدثہ ان رسول اللہ صلعم جلس فی مرضہ الذی مات فیہ وقال صلعم انی واللہ لا یمسک الناس علی بشیٔ انی لا احل الا ما احل اللہ فی کتابہ ولا احرم الا ما حرم اللہ فی کتابہ" (الاحکام لابن حزم ج ۲ ص ۸۰)

حجاج بن المنہال نے عبد الوہاب الثقفی، یحییٰ بن سعید اور ابن ابی ملیکہ کے واسطوں سے ابن عمیر کی یہ روایت بیان کی کہ ابن عمیر فرماتے تھے کہ جب حضورؐ مرض الموت میں مبتلا تھے تو ایک دفعہ بیٹھے تھے۔ دفعتاً فرمایا " خدائے بلند و برتر کی قسم، میں نے بذاتِ خود لوگوں کو کسی چیز سے نہیں روکا۔ میں نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جسے اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں حلال نہ کیا ہو اور میں نے ایسی کوئی چیز حرام نہیں کی جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام نہ کیا ہو۔

حضرت عائشہؓ کی یہ مرفوع روایت بھی سنئے۔

حدثنا علی بن عاصم عن یحییٰ بن سعید عن ابن ابی ملیکہ عن عائشہؓ مرفوعاً لا تمسکوا علیّ شیئاً فانی لا احل الا ما احل اللہ فی کتابہ ولا احرم الا ما حرم اللہ فی کتابہ (رواہ الزعفرانی)

علی بن عاصم، یحییٰ بن سعید اور ابن ابی ملیکہ کے واسطوں سے حضرت عائشہؓ کی یہ مرفوع روایت بیان کرتے کہ نبی صلعم نے فرمایا " میں نے تم پر کوئی چیز بند نہیں کی۔ بیشک میں نے صرف اسی چیز کو حلال کیا جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا تھا اور صرف اسی چیز کو حرام کیا جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

اخبرنا ابن عیینہ باسنادہ عن رسول اللہ صلعم انہ قال لایمسکن الناس علی بشی فانی لا احل لھم الا ما احل اللہ ولا احرم علیھم الا ما حرم۔ (کتاب الام ج ۷، ص۲۶۵)

ہمیں اسناد کے ساتھ ابن عیینہ نے خبر دی کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا میں نے لوگوں کو کسی چیز سے نہیں روکا۔ بیشک میں نے اسی چیز کو ان پر حلال کیا جو اللہ نے حلال کی تھی اور اسی چیز کو ان پر حرام کیا جو اللہ نے حرام ٹھہرائی تھی۔

انہی الفاظ میں طاؤس کی یہ مرسل روایت وارد ہوئی ہے۔

قال صلعم لایمسکن الناس علی بشیٔ فانی لا احل لھم الا ما احل اللہ ولا احرم علیھم الا ما حرم (اخرجہ البیھقی فی المعرفۃ)

نبی صلعم نے فرمایا میں نے لوگوں کو کسی چیز سے نہیں روکا۔ بیشک میں نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو اللہ نے حرام ٹھہرائی ہو اور کوئی ایسی چیز حرام نہیں کی جسے اللہ نے حلال ٹھہرایا ہو۔

حضرت عقبہؓ سے بھی اسی طرح کی روایت وارد ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

قال صلعم لایمسکن الناس علی بشی فانی لا احل لھم الا ما احل اللہ و لا احرم علیھم الا ما حرم۔ (اخرجہ البیھقی فی المعرفۃ۔ ابن سعد)

نبی صلعم نے فرمایا بے شک میں نے لوگوں پر کوئی چیز بند نہیں کی۔ میں نے صرف اسی کو حلال کیا جسے اللہ نے حلال کیا اور اسی کو حرام کیا جسے اللہ نے حرام کیا۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی متذکرہ روایت اور طرق سے بھی وارد ہوئی ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

لا تمسکو علی شیأ فانی لا احل الا ما احل اللہ فی کتابہ ولا احرم الا ما حرم اللہ فی کتابہ۔ (اخرج الطبرانی فی الاوسط۔ کنز العمال ج ۱ ص۵)

میں نے تم پر کوئی چیز بند نہیں کی۔ بے شک میں نے اسی کو حلال کیا جسے کتاب اللہ نے حلال کیا اور اسی چیز کو حرام کیا جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام ٹھہرایا۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

حدثنا الثقۃ عن رسول اللہ صلعم قال فی مرضہ الذی مات فیہ:

انی لاحرم ما حرم القرآن! واللہ لا یمسکون علی بشیئ۔

(الرد علی سیر الاوزاعی ص ۲۱)

ہمیں ثقہ حضرات سے رسولِ خدا کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ آپ نے مرض الموت میں فرمایا بے شک میں نے اسی چیز کو حرام کیا جسے قرآن نے حرام ٹھہرایا تھا۔ اور اللہ کی قسم میں نے لوگوں پر کوئی اور چیز بند نہیں کی۔

بخوفِ طوالت ہم باقی روایات کو چھوڑ کر امام ابوداؤد کی واردکردہ معروف حدیث بیان کئے دیتے ہیں جو حضرت سلمان فارسیؓ نے بیان فرمائی ہے۔

قال النبی صلعم: الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ وھو مما عفا عنہ

(ابوداؤد شریف)

رسولِ خدا صلعم نے فرمایا حلال وہی ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا۔ اور حرام وہی ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا۔ رہی وہ چیزیں جن کا کتاب اللہ میں ذکر نہیں تو وہ معاف ہیں۔

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کا حدیث سے منسوخ ہونا تو کجا آپ کا یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ حدیث کتاب اللہ پر زیادتی کرسکتی ہے اور ہاں یہ جو ملاں جبر دستنا رکھا کرتے ہیں کہ حدیث نہ ہو تو کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام۔ ان کو بھی آگاہ کر دیجئے کہ حضورؐ نے اس معاملہ میں کیا کچھ فرمایا۔

آخر میں ایک اور روایت درج کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ روایت بھی اسی جنسی واقعہ کے سلسلہ میں امام ابویوسفؒ بیان فرماتے ہیں۔ جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا۔

حدثنا اشعث[۱۵] بن سوار واسمٰعیل[۱۶] بن ابی خالد عن الشعبی

---

[۱۵] اشعث بن سوار الکندی سے التوابیت مراد ہیں جو اہواز کے قاضی رہے ہیں وہ حسن، ابن سیرین اور دیگر تابعین سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے شعبہ، حفص بن غیاث اور ہشیم وغیرہ ثقہ حضرات روایت کرتے ہیں۔ سنہ ۱۳۶ھ میں فوت ہوئے ابوداؤد کے سوا صحاح ستہ کے باقی مصنفین نے ان سے روایات لی ہیں۔ (سیفی)

[۱۶] اسمٰعیل بن ابی خالد البجلی الاحمسی، ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے معروف عالم ہیں۔ عبداللہ بن ابی، ردفی، ابوجحیفہ، عمرو بن حریث اور شعبی جیسے ثقہ حضرات سے روایات کرتے ہیں۔ ان سے سفیان، شعبہ اور ابن ادریس روایت کرتے ہیں۔ صحاح ستہ میں ان کی روایات موجود ہیں۔ (ترمذی)

عن[خلہ] قرظہ بن کعب الانصاریؓ انہ قال اقبلت فی رھط من الانصار الی الکوفہ فشیعنا عمرؓ بن الخطاب یمشی حتی انتھینا الی مکان ثم قال ھل تدرون لم مشیت معکم یا معشر الانصار قالوا: نعم لحقنا قال: ان لکم الحق، ولکنکم تاتون قوما لھم دوی بالقرآن کدوی النحل فاقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلعم وانا شریککم۔ فقال قرظۃ لا احدث حدیثاً عن رسول اللہ صلعم ابداً (الرد علی سیر الاوزاعی ص۳۰)

ہمیں اشعث بن سوار نے اسمٰعیل بن ابی خالد اور شعبی کے واسطوں سے حضرت قرظہ بن کعب الانصاری کی یہ روایت سنائی کہ حضرت قرظہ نے فرمایا میں انصار کے ایک گروہ کے ساتھ کوفہ جا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب ایک مقام تک ہمارے ساتھ چلتے آئے پھر فرمایا "کیا تمہیں معلوم ہے تمہارے ساتھ کیوں آ رہا ہوں اے معشر انصار!" انصار نے کہا "ہاں یہ ہمارا حق ہے" آپ نے فرمایا یہ ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ تم ان لوگوں کے پاس جا رہے ہو جہاں کے لوگوں کی آواز قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہے۔ (انہیں حدیثوں میں نہ الجھا دینا) پس رسول خدا صلعم کی حدیثیں بہت کم بیان کرنا اور میں بھی اس معاملہ میں تمہارا شریک ہوں۔ حضرت قرظہ کہتے ہیں یہ سنکر میں نے کہا "میں ابد تک حضورؐ کی کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا"

یہی روایت ابن ماجہ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

عن احمد بن عبدہ عن حماد بن زید عن مجالد عن الشعبی عن قرظۃ بن کعب الانصاری قال بعثنا عمرؓ بن الخطاب الی الکوفہ وشیعنا فمشی معنا الی موضع یقال لہ

خلہ حضرت قرظہؓ بن کعب معروف صحابہ میں سے ہیں، احد میں شریک تھے۔ فاروقؓ اعظم کے زمانے میں رے کی فتح میں بھی شریک جنگ تھے۔ شاید یہ اسی وقت کی بات کہہ رہے ہیں جس وقت انہیں کوفہ کا والی مقرر کیا گیا تھا۔ (دیکھئے تجرید الاسماء الصحابۃ۔ ذہبی)

صرار فقال اتدرون لم مشیت معکم؟ قلنا لحق صحبة رسول الله صلعم و لحق الانصار قال: لکنی مشیت معکم لحدیث اردت احدثکم به فاردت ان تحفظوه لممشای معکم: انکم تقدمون علی قوم للقرآن فی صدورهم هزیز کهزیز المرجل فاذا راؤکم مدوا الیکم اعناقهم وقالوا اصحاب محمد فاقلوا الروایة عن رسول الله ثم انا شریککم۔

(ابن ماجہ)

محمد بن عبدہ، حماد بن زید، مجالد اور شعبی کے واسطوں سے حضرت قرظہ بن کعب الانصاری کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم لوگوں کو فاروق اعظمؓ نے کوفہ بھیجا اور خود بھی مقام صرار تک ہمارے ساتھ چلتے گئے۔ پھر آپ نے فرمایا "کیا تمہیں معلوم ہے میں کیوں یہاں تک آیا" ہم نے کہا ہاں ہمیں علم ہے ہم چونکہ انصار ہیں اور اصحاب رسولؐ ہیں اس لئے آپ ہماری عزت افزائی فرما رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا "ہاں لیکن میں تو اس لئے آ رہا ہوں کہ تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے اور اس جگہ تک چل کر آیا ہوں تاکہ تمہیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے بات یہ ہے کہ تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جن کے سینوں میں قرآن بڑے جوش و خروش کے ساتھ موجزن رہتا ہے۔ پس جب تم دیکھو کہ وہ اپنی گردنیں تمہاری طرف لمبی کر کر کے کہہ رہے ہیں کہ یہ حضورؐ کے صحابہ ہیں تو حضورؐ کی نسبت کم روایتیں ان سے بیان کرنا"

سُنا آپ نے فاروقِ اعظمؓ نے کیا ارشاد فرمایا ہے "احادیث کم بیان کرنا" کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جب احادیث پھیلنے لگیں گی تو کتاب اللہ کی طرف سے لوگوں کی رغبت کم ہو جائے گی۔ مگر مقتدر صحابہؓ کی اس احتیاط کے باوجود بعد میں آنے والوں نے اپنی تمام رغبت حدیث پر صرف کر دی۔ اور قرآن سے محبت کا عالم یہ ہوا کہ درس نظامی میں ایساغوجی[ؔ] تک کے پلندے تو پڑھائے جاتے ہیں۔ احادیث بھی بہ کثرت پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن کی تفاسیر میں سے صرف تفسیر جلالین پڑھائی جاتی ہے جس کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ اس کے چھ کلمے قرآن سے زائد ہیں۔

قرآن کو چھوڑ کر احادیث کی طرف رغبت کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ قرآن زبان سے کچھ کہہ دینے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

ؔ ایساغوجی، یونانی منطق کی ایک کتاب ہے۔ اس کے نام سے ہی ہنسی آتی ہے تو خود اندازہ لگائیے کہ اس میں کون سے "دقائق و معارف" زیر بحث لائے گئے ہوں گے۔

قرآن تو عمل پر زور دیتا ہے۔ مگر آپ کو بیشتر ایسی روایات مل جائیں گی جن میں محض چند لفظوں کو دہرا دینے پر ہاشے فیاض محدثین نے نیکیوں کی لاکھوں گٹھڑیاں تقسیم کر دی ہیں۔ آخر میں ہم حضرت سلمانؓ فارسی جیسے منقت در معظم صحابی کا ایک قول نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں :-

سلمان بمردم گفت : گریختید از قرآن بسوے حدیث زیرا کہ قرآن را کتاب دقیقے یافتید در آنجا شمارا حساب می نمائید بر قطمیر و فتیل یعنی بامر خورد ے و ریزہ بر قید دانۂ خورد ے پس تنگی کرد بر شما احکام قرآن پس گریختید بسوئے حدیث کہ کار را بر شما کشادہ و آسان کردہ است۔

(حیات القلوب جلد دوم ص۶۱۰)

حضرت سلمانؓ فارسی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا۔ تم کتاب اللہ سے بھاگ کر حدیث کی طرف گئے کیونکہ تم نے دیکھا کہ قرآن بلند کتاب ہے اور اس میں ذرا ذرا سی باتوں پر گرفت ہوتی ہے اور جب تم نے دیکھا کہ قرآن کے احکام بجا لانا تمہارے لئے دشوار ہے اور قرآن تم پر تنگی کر رہا ہے تو تم حدیثوں کی طرف بھاگے جنہوں نے کام کو تم پر کشادہ و آسان کر دیا۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِي فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

مُفت

مجرب دوا برائے :- دمہ۔ دردِ گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ :-

حاجی محمد دین۔ سٹینج آئس فیکٹری۔ متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ کراچی۔

نوٹ :- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

حقائق و عبر

خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست

ہمارے ہاں اخلاقیات میں بچے کو پہلا سبق یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ـــــ خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست ـــــ بڑوں کی غلطی پکڑنا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ صرف بچوں ہی کو نہیں پڑھایا جاتا بلکہ مذہب کی دنیا میں ایک ایسا بنیادی اصول بنا دیا گیا ہے جس پر اسلاف پرستی کی عظیم عمارت استوار ہے۔ آپ نے جہاں کوئی بات ایسی کہی جو گزرے ہوئے بزرگوں میں سے کسی قول کے خلاف ہو آپ پر کفر اور بے دینی کا فتویٰ لگا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اسلاف ہوں یا اخلاف، بشری کمزوریاں سب کے ساتھ لگی ہیں اور ہر ایک سے سہو اور خطا (غلطی) کا امکان ہے۔ بعض اوقات یہ غلطیاں کیسی حیرت انگیز ہوتی ہیں اس کی ایک مثال ہفت روزہ "المنبر" کی ۳ر جنوری ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مضمون (فرقہ واریت کا عفریت اور اس کی ہلاکت آفرینیاں) میں مذکور ہے جسے پیش قارئین کیا جاتا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیہ الرحمۃ کی ذات گرامی دنیائے علم میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیری حواشی کتاب اللہ کے ساتھ ان کے شغف کی بین دلیل ہیں ان کی ایک کتاب ہے ایضاح الادلہ جو اہل حدیث کے رد میں لکھی گئی ہے اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ " اولی الامر ـــ یعنی ائمہ مجتہدین بھی واجب الاتباع ہیں۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ ایک قرآنی دلیل پیش فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ ارشاد ہوا فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِلٰی اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ"

اور ظاہر ہے کہ اولی الامر سے مراد اس آیت میں سوائے انبیاء کرام علیہ السلام اور کوئی نہیں۔ سو دیکھئے آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء وجملہ اولی الامر واجب الاتباع ہیں آپ نے فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ الخ

كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" تو دیکھی اور آپ کو ایسا کہ معلوم نہ ہوا کہ جس قرآن مجید میں یہ آیت ہے اسی قرآن میں آیت مذکورہ بالا معروضہ حضرتؒ بھی موجود ہے۔ عجب نہیں آپ تو دونوں آیتوں کو حسب عادت متعارض سمجھ کر ایک کے ناسخ اور دوسرے کے منسوخ ہونے کا فتویٰ لگانے لگیں۔

آپ قرآن کریم کھولئے اور اس میں سورۃ النساء کی آیت ۵۹ نکالئے وہ یوں ملے گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ——————— (۴/۵۹)

اب آپ دیکھئے کہ جناب شیخ الہند جیسی صاحب علم (مترجم و مفسر قرآن) ہستی سے ایک آیت کے سلسلے میں کتنی غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔ یعنی

(۱) فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ ... میں وَ اِلٰی اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ کا اضافہ اپنی طرف سے کر لیتے ہیں
(۲) اس اضافے کے لئے آیت قرآنی قرار دے کر اس سے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں قرآنی سند پیش فرماتے ہیں۔
(۳) ایک ہی آیت کے دو حصوں کو قرآن کی دو الگ الگ آیات قرار دیتے ہیں اور
(۴) اپنے سہو کو بالکل صواب سمجھ کر فریق مقابل پر سخت طنز کرتے ہیں۔

المنبر میں چھپنے والے مضمون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مولانا مرحوم کی یہ کتاب (ایضاح الادلہ) پہلے مولانا سید اصغر حسین علیہ الرحمۃ کی زیر نگرانی چھپی اور اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن چھپے لیکن کسی میں اس کی تصحیح نہیں کی گئی نہ معلوم کتنے علمائے کرام نے شیخ الہند علیہ الرحمۃ کی اس دلیل کو قرآنی سند کے طور پر تسلیم کیا اور مخالفین کے رد میں پیش کر کے "ان کا منہ بند کیا ہوگا"۔

یہ ایک معمولی سی مثال ہے اس امر کی کہ سہو و خطا کا امکان ہر ایک سے ہے۔ ظاہر ہے کہ شیخ الہند مرحومؒ تو (خدا نکردہ) ایسے جاہل تھے کہ انہیں اتنا بھی معلوم نہ ہو کہ قرآن کریم کی اصل آیت کیا ہے اور نہ ہی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے (معاذ اللہ) دانستہ قرآنی آیت میں اس قسم کی تحریف کر کے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہ بہر حال سہو ہے۔

اس ایک مثال سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف کی کتابوں میں سہو و خطا کا امکان کس قدر ہو سکتا ہے یہ وجہ ہے جو ہم بار بار پکارتے ہیں کہ اسلاف کی خدمات ہمارے سر آنکھوں پر۔ لیکن انہیں منزہ عن الخطا اور معصوم تو کسی صورت میں بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سہو و خطا سے پاک، خدا کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے جو کچھ بزرگوں سے ہمارے پاس آیا ہے اسے خدا کی کتاب پر پرکھ کر دیکھو۔ اگر اس میں کوئی ایسی بات پائی جائے جو خدا کی کتاب کے خلاف ہو تو اسے مسترد کر دو۔ اس سے نہ ان کی شان پر بٹہ لگ جائے گا نہ آپ کسی جرم کے مرتکب ہوں گے۔ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کا مسئلہ بدیہی طور پر غلط اور بے حد مضر نتائج کا موجب ہے۔

رابطۂ باہمی

لاہور - بزم باقاعدگی سے اپنے اجتماعات کا انعقاد عمل میں لا رہی ہے۔ پرویز صاحب کا درس قرآن ہر اتوار کی صبح کو ہوتا ہے۔ اور اس ہفتہ وار اجتماع کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے بزم کے احباب کوشاں رہتے ہیں۔ بزم جشن نزولِ قرآن کی سالگرہ منانے کے لئے بھی شایانِ شان انتظامات بروئے کار لا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے سالانہ کنونشن کے انعقاد کی تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں۔ اس کے لئے تقسیم کار اور سب کمیٹیوں کی تشکیل کا اہم مسئلہ بھی زیر غور ہے اور آئندہ اجلاس میں اس کے متعلق ضروری فیصلے طے پا جائیں گے۔

کراچی - بزم کا ماہانہ اجتماع باقاعدگی سے سرانجام پاتا ہے۔ اس اجتماع کی اہمیت کے پیش نظر تمام اراکین بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ ماہ گزشتہ کے کام کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آئندہ ماہ کے لئے مناسب پروگرام ترتیب دیا جاتا ہے۔ بالخصوص درسِ قرآنی کے ہفتہ وار اجتماع کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے امکانات زیرِ غور لائے جاتے ہیں۔ اور انہیں بروئے کار لانے پر پوری توجہ دی جاتی ہے۔ اس اہم اجتماع کے علاوہ ہفتہ کے دیگر ایام میں شہر کے مختلف حصوں میں پرویز صاحب کے درسِ قرآنی کے ٹیپ سنانے کا منصوبہ بھی پیش نظر ہے۔ اس کیلئے بزم نے ایک نیا ٹیپ ریکارڈر خرید لیا ہے اور امید ہے کہ اس پروگرام کی بدولت قرآن کی انقلابی فکر کراچی کے تمام گوشوں میں فردوسِ گوش بن سکے گی۔ لٹریچر کی تقسیم منظم طور پر جاری ہے اور اس معاملہ میں طلباء، اساتذہ اور کالجوں کے پروفیسروں کو بالخصوص زیادہ سے زیادہ لٹریچر مہیا کیا جا رہا ہے۔ ایک مرکزی لائبریری کا قیام بھی بزم کے پروگرام میں شامل ہے لیکن مناسب جگہ کے حصول سے یہ مقصد حسن و خوبی سے تکمیل پا جائے گا۔ آئندہ کنونشن کے سالانہ اجتماع کے لئے احباب نے ابھی سے تیاریاں شروع کر دی ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے پر غور ہو رہا ہے۔

عید جشنِ نزولِ قرآن کی تقریب سعید کے سلسلے میں احباب نے ۲ مارچ کو عید ملاپ پارٹی کے انعقاد کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

مولانا عبدالرب صاحب نے مقامی احباب سے اپیل کی ہے کہ قرآنی فکر کی روشنی میں ذہنی انقلاب کے ساتھ قلب و نگاہ میں تبدیلی اور سیرت و کردار کی تعمیر پر پوری توجہ دی جائے۔ اس کے لئے ہر قدم پر محاسبۂ خویش کی اشد ضرورت ہے۔ نمائندہ بزم محترم محمد شفیع صاحب نے احباب پر زور دیا ہے کہ صوم و صلوٰۃ کے قرآنی پروگرام کی تکمیل انتہائی باقاعدگی اور شدت سے کی جائے۔

کوئٹہ

بزم کے اجلاس باقاعدگی سے جاری ہیں۔ شدتِ سرما کے باعث اگرچہ بعض اجتماعات میں حاضری کی کمی رہی۔ اس کے باوجود ہر اجلاس میں محترم حسن عباس رضوی کے خطابات نے شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان پیدا کئے رکھا۔ محترم رضوی صاحب لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی روشنی میں ان دنوں سورۂ النساء کا درس کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دیگر بزموں کے احباب کی اطلاع کیلئے بزم کا ایڈریس درج ذیل ہے۔

۳۔ سپرنٹنڈنٹ ہاؤس۔ وائٹ روڈ۔ کوئٹہ

سرگودھا

بزم کے نئے نمائندہ، محترم ارشد محمود صاحب کا انتخاب، احباب میں اتحاد کے قیام اور جمود و انتشار کے خاتمہ کا باعث ہوا ہے۔ احباب ایک نئے ولولے سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں سرگرم ہیں اور اس مقصد کے لئے ایک ہفتہ وار مقامی اخبار کی خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں۔ بزم کے حالیہ اجلاس میں رکن بزم محترم نور محمد صاحب کے والد مرحوم کی وفات پر دعائے مغفرت کے بعد تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

جہلم

ڈاکٹر محمد اعظم بزم کے نئے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ بزم کے عام اجلاس ہر ہفتہ کی شام کو باقاعدگی سے منعقد ہو رہے ہیں۔ ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو ایک عام اجتماع میں جو ڈاکٹر حقیق مرزا صاحب کے دولت کدہ پر ہوتا ہے، پرویز صاحب کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔ محترم شاد صاحب جو راولپنڈی سے تبدیل ہو کر یہاں آگئے ہیں، احباب بزم کے لئے موثر پروگرام پیش کر رہے ہیں اور اس سے آئندہ اجتماعات میں احباب کو باہمی افہام و تفہیم سے قرآن کی حکمتوں سے مستفید ہونے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ بزم نے یہاں کی مختلف لائبریریوں کے نام طلوع اسلام جاری کرانے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

بوریوالہ

بزم حسب سابق سرگرم عمل ہے۔ باہمی افہام و تفہیم سے قرآنی تحریک کے مقاصد اہل علم و فکر طبقہ پر واضح کئے جا رہے ہیں۔ لٹریچر کی تقسیم باقاعدگی سے جاری ہے۔

میانوالی

محترم محمد رفیق صاحب ایڈووکیٹ کی سرپرستی میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں موثر اقدامات

کی گئی ہیں۔ صوفی عبدالرحمٰن صاحب بزم کے نئے نمائندہ مقرر ہوئے ہیں خواتین کے حلقہ میں محترمہ اور شمیم صاحبہ کی مخلصانہ مساعی سے قرآنی فکر کی روشنی حسن وخوبی سے پھیل رہی ہے اور اس سے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ بڑے خوشگوار اور خوش آیند ہیں۔

ڈیرہ غازیخان پمفلٹوں کی تقسیم اور نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع سے بزم قرآن کریم کی روشنی کو اہل علم و بصیرت کے ہر حلقے میں پھیلا رہی ہے پرویز صاحب کے درس قرآن کے سلسلے میں ٹیپ ریکارڈ کی خرید کیلئے حسب ضرورت سرمایہ کی فراہمی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

رسول نگر چوہدری سردار خان صاحب کی کوششوں سے بزم کا وجود ثابت رہا ہے۔ چوہدری رحمت اللہ صاحب نے از سر نو بزم کی نمائندگی کا منصب سنبھالا ہے۔ انہوں نے احباب کو ہدایت کی ہے کہ اجلاس ہائے بزم میں باقاعدگی سے شریک ہوں بحث تمحیص سے بچیں۔ اور لٹریچر کی تقسیم کی ذریعہ تعمیری جدوجہد سے کام لیں۔

بستی بزمانی (ضلع ڈیرہ غازیخان) دیہات کی تاریک فضا میں اس نئی بزم کے غریب لیکن مخلص احباب نے قرآنی فکر کا ننھا سا دیا روشن کیا ہے اور اسے عزم و ہمت سے باد مخالف کے تیز و تند جھونکوں سے بچا کر قرآن کی آواز کو حسب استطاعت بلند کر رہے ہیں۔ حکیم خدا بخش صاحب بزمانی کے حسن تبلیغ نے جہاں دیہاتی فضا میں روشنی پیدا کی ہے وہاں احباب بزم کو بھی ایک نیا ذوق و شوق عطا کیا ہے۔

ایک مخلص قرآنی رفیق کی مفارقت

انتہائی غم اور صدمے کے ساتھ یہ اطلاع ملی ہے کہ رفیق محترم بشیر احمد سوی (جنہیں احباب بشیرا حمد بابا کہہ کر پکارا کرتے تھے) دنیا سے رخصت ہو گئے مرحوم شمع قرآنی کے پروانے تھے ساری عمر کتاب اللہ پر غور و فکر میں گزاری۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پہلا نپور ایک عزیز کے پاس راولپنڈی میں مقیم رہے اور وہاں کے قرآنی حلقے کو اپنی بصیرت قرآنی سے مستفید کرتے رہے دو تین برس ادھر سے لاہور تشریف لائے اور باوجود کبر سنی اور ضعف پیری کے پرویز صاحب کے درس قرآن میں التزاماً شریک ہوتے رہے۔ مرحوم اخلاق کے پیکر اور محبت کے مجسمہ تھے۔ سادگی ایسی کہ ناواقف کو ان کی علمی فضیلت کا اندازہ تک نہ ہو سکے۔ کبھی کبھی کچھ لکھا بھی کرتے تھے جو طلوع اسلام میں شائع ہوتا رہا۔ ہمیں اپنے اس مخلص رفیق کی مفارقت کا بڑا صدمہ ہے خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

طلوع اسلام کنونشن

طے پایا ہے کہ طلوع اسلام کنونشن کا سالانہ اجتماع ۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ کو لاہور میں منعقد ہوگا۔ اس سلسلے میں بزموں کو باضابطہ ہدایات عنقریب الگ ارسال کی جا رہی ہیں۔

کنونشن کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے بزمیں ابھی سے سرگرم کار ہو جائیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵-بی گلبرگ - لاہور

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
(اقبالؒ)

احتِسَاب

(۹)

ایک مملکت کی شایانِ شان تعمیر و ترقی کے لئے حکومت اور اس کے کارفرماؤں کا محاسبہ اشد ضروری ہے۔ لیکن یہ محاسبہ کسی انتقامی رجحان پر مبنی نہ ہو بلکہ حُسنِ نیت اور تعمیری عزائم کا آئینہ دار ہو۔ پاکستان میں ایسے عناصر موجود ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ذلیل ترین حربوں سے کام لیا اور اس مخالفت کے باوجود جب یہ تحریک ایک محسوس و مشہود حقیقت بن کر سامنے آگئی تو ان عناصر نے اپنی شکست کے گہرے زخموں کی تسکین کے لئے، مملکت کے محسن کارفرماؤں کے سپاس گزار بننے کے بجائے ان پر رکیک حملے شروع کر دئے اور ان کی یہ روش آج تک برابر جاری ہے۔

طلوعِ اسلام کی راہ اس سے قطعاً مختلف ہے۔ اس نے دینی تقاضوں کی بجاآوری کے لئے اس تحریک کا پورا پورا ساتھ دیا اور جب پاکستان حاصل ہوگیا تو اس نے اربابِ اقتدار پر کڑی سے کڑی تنقید بھی کی۔ صاف ظاہر ہے کہ اس تنقید میں کسی انتقامی روش کا عمل دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کارفرمایانِ مملکت کے احتساب کا یہ فریضہ طلوعِ اسلام کے کالموں میں مسلسل اور پوری جرأت سے سرانجام پاتا رہا۔ اس سلسلۂ احتساب کی نویں قسط ہدیۂ قارئین ہے۔

(ادارہ)

دستور مملکت کا نیا مسودہ

۱۹۵۶ء کے آغاز میں دستور مملکت کا نیا مسودہ منظر عام پر آیا۔ پاکستان کی مجلس دستور ساز میں اس پر بحث کا آغاز ہو چکا تھا اور مختلف حلقے اس کی تائید میں سرگرم تھے کہ فروری ۱۹۵۶ء کے مقالہ افتتاحیہ میں طلوع اسلام نے اس مسودہ کا بغور جائزہ لیا اور اس کی مختلف دفعات اور بین السطور کا تجزیہ کرتے ہوئے حسب ذیل سطور سے مقالہ کا آغاز کیا۔

بہت دنوں کے انتظار کے بعد بالآخر دستور پاکستان کا ایک جدید مسودہ منظر عام پر آگیا۔ جو اس وقت مجلس آئین ساز کے زیر بحث ہے۔ یوں تو ہر ملک کا دستور ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ دستور ہی وہ بنیاد ہوتی ہے جس پر اس مملکت کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے لیکن پاکستان کے معاملہ میں یہ اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب اہل امریکہ نے محترم لیاقت علی خاں (مرحوم) سے پوچھا تھا کہ آئین پاکستان کی تسوید میں اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے تو انھوں نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ اگر ہمارا معاملہ بھی دنیا کی اور مملکتوں جیسا ہوتا تو ہم اپنا آئین کبھی کا بنا چکے ہوتے لیکن پاکستان کا معاملہ دنیا کی عام مملکتوں سے بالکل الگ ہے۔ ہم پاکستان کو اسلامی تصورات و نظریات حیات کی عملی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ جس کے نتائج دنیا پر اس حقیقت کو منکشف کر دیں گے کہ اسلام کی تعلیم کس قدر بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس لئے پاکستان کا دستور بھی ایسا ہوگا جس کی مثال آپ کو کہیں نہیں مل سکے گی۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے آئین کی تسوید میں اس قدر تاخیر ہو رہی ہے۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۵۶ء صفحہ ۲)

یہ تھا ہمارا بلند بانگ دعویٰ اپنی مملکت کے زیر تسوید آئین کے بارے میں! لیکن جب اس کا مسودہ سامنے آیا تو اس دعوے کی حقیقت بھی الم نشرح ہو کر رہ گئی۔ طلوع اسلام کے الفاظ میں سنئے۔!

اس قسم کے دعاوی کے پس منظر میں اس مسودہ کو دیکھا جائے تو بے حد افسوس ہوتا ہے اس سے پہلے دنیا مسلمانوں کی حالت سے اسلام کی تعلیم کا اندازہ لگایا کرتی تھی۔ اور کہا کرتی تھی کہ اگر اسلام نوع انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا تو اس کی حامل قوم کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ اب دنیا یہ کہے گی کہ اگر اسلامی تصورات حیات کا مظہر اس قسم کا آئین ہے تو اسلامی نظام کو بے مثل و بے نظیر کیسے کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان تو ہمیں بلا مزد و معاوضہ مل گیا۔ لیکن اس کے بعد ہمارے ارباب حل و عقد اس قسم کے دعاوی سے کہ ہم اس خطۂ زمین کو اسلامی نظام زندگی کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایک عجیب مصیبت میں پھنس گئے۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ جس طرح ہم

اس سے پہلے اس قسم کی "شاعری" سے عوام کو خوش کر کے وقت گزار لیا کرتے تھے، اب بھی یہی ہوگا لیکن انھوں نے اس کا احساس نہ کیا کہ اب حالات مختلف ہو چکے ہیں۔ اب خالی "شاعری" سے کام نہیں چلے گا۔ اب ہر مصرع پر عملی گرہ لگانی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کا بھی احساس نہ کیا کہ بلا سوچے سمجھے "اسلامی دستور" اور "اسلامی نظام" کے دعووں سے وہ ان مفاد پرست گروہوں کے ہاتھ میں کتنا زبردست حربہ دے رہے ہیں۔ جو مذہب کے نقاب میں اپنی ہوس اقتدار کی تسکین تلاش کرتے ہیں۔ اور جو اپنی اس شکست کا انتقام جو انہیں قائد اعظمؒ کے ہاتھوں (حصولِ پاکستان کی شکل میں) ملی تھی۔ کن کن "مقدس" حیلوں سے لینا چاہتے ہیں۔ یہ تھا ہمارے اربابِ بست و کشاد کا عدم تدبر اور اسلام کے متعلق صحیح علم و تصور کا فقدان جس کی وجہ سے مملکتِ پاکستان کی آئین سازی کی کشتی، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح، آٹھ سال سے ایک ہی مقام پر چکر لگا رہی ہے اور ساحلِ مراد کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکی (ایضاً)

مسودۂ دستور کی افسوسناک خامیوں کا حقیقی محرک کیا تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس ناگوار حقیقت کو بھی آئندہ سطور میں بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ اور اپنی مخصوص بے لاگ تنقید کا یہ پہلو منظرِ عام پر لاتے ہوئے لکھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر اس مسودہ کے مرتبین ملک کے "سیاسی مذہب پرستوں" کی غوغا آرائی سے مرعوب نہ ہو جاتے تو یہ مسودہ اپنی موجودہ شکل سے کہیں بہتر ہوتا۔ اس میں جو خامیاں ہیں وہ صحیح فہم کے فقدان کے مقابلہ میں جرأت و ہمت کی کمی کی زیادہ غماز ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسودہ کے مرتبین کے ذہن پر یہ خیال غالب تھا کہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اہم اختلافی معاملات میں فیصلہ کن شقیں رکھ کر خواہ مخواہ کی مخالفت مول لیں۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح اس مصیبت کو اپنے سر سے ٹال دینا چاہیئے۔ آنے والے اس کے نتائج خود بھگتیں گے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس آئین کو آئینِ مفاہمت (CONSTITUTION OF COMPROMISE) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مذہب اور سیاست میں مفاہمت۔ اصول اور مصلحت میں مفاہمت۔ مشرق اور مغرب میں مفاہمت۔ اے کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ حق اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے اور اپنے اندر مفاہمت کی ذرا بھی گنجائش نہیں رکھتا۔ (ایضاً)

نمائندگانِ دستوریہ اور فکر و بصیرت کا فقدان

دستور مملکت کے لئے مسودہ پر دستوریہ میں بحث جاری تھی۔ پورے ملک کی نگاہیں دارالسلطنت کراچی کے ایوانِ دستوریہ پر مرکوز تھیں اور

املاک وملت کے وہ نمائندے جنہیں تعمیر مملکت کا دستوری ضابطہ مرتب کرنے کی عظیم الشان ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں، فکر و نگاہ کی سنجیدگی سے کام لینے کے بجائے ایسے اوچھے ہتھکنڈے ایک دوسرے کے خلاف بروئے کار لا رہے تھے۔ اور دستوری مباحث میں ایسی مضحکہ خیزیاں سرزد ہو رہی تھیں کہ طلوع اسلام کے لئے ضبط کی تاب نہ رہی۔ چنانچہ مارچ ۵۶ء کے مقالہ افتتاحیہ کا آغاز کرتے ہوئے لکھا:۔

> فروری کے یہ تین ہفتے، مجلس دستور ساز میں، مسودۂ دستور آئین پاکستان پر بحث وتمحیص میں گزر گئے۔ اس حقیقت کے اعتراف اور اظہار پر تاسف بھی ہوتا ہے۔ اور ندامت بھی کہ بحث کی سطح ایسی رہی جس سے ہم دنیا والوں کی نگاہوں میں کوئی اونچا مقام نہیں حاصل کر سکے۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی قوم پستی کی طرف جا رہی ہو تو وہ کسی ایک شعبۂ زندگی ہی میں پست نہیں ہوتی اس کی زندگی کی پوری سطح پست ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اس کا مظاہرہ ہر گوشۂ بساط پر ہوتا رہتا ہے۔ اس بحث میں یوں تو قریب قریب ہر موقع پر کوئی نہ کوئی تعجب انگیز اور مضحکہ خیز بات سامنے آجاتی رہی۔ لیکن جب کوئی معاملہ اسلام سے متعلق زیر بحث آیا تو اس وقت جس قسم کی جہالت یا معکوس ذہنیت کا مظاہرہ ہوا وہ ہر قلب حساس کے لئے موجب ہزار عبرت تھا۔ اس سے صاف نظر آگیا کہ جب تک ہمارے ارباب سیاست کی زبان پر اسلام کا نام بطور ایک سلوگن کے رہتا ہے ان کا بھرم تیار رہتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی موقع پر اس کے نقطہ کی وضاحت پہ مجبور ہو جاتے ہیں تو اس وقت وہ اس قسم کی بولیاں بولتے ہیں جس سے انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کیا یہ لوگ، اسلام کے نام لیوا ہونے کے باوجود، اس کی اصل و بنیاد سے اس درجہ ناواقف ہیں؟ اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس جہالت میں یہ آگے ہیں یا ہمارا مُلّا؟
>
> (شمارہ مارچ ۵۶ء۔ صک)

خودکشی کا ذمہ کون؟

اخبارات میں ایک روداد۔ لاہور کے ایک مظلوم مہاجر شہاب الدین کی خودکشی کی دردناک تفاصیل شائع ہوئیں، جن میں بتایا گیا کہ یہ مصیبت زدہ انسان اپنے وسیع کنبہ کی کفالت کے لئے ایک کارخانہ میں ملازم تھا۔ جہاں اس کا ایک ہاتھ مشین میں کٹ جانے کے باعث اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اور جب اس نے اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لئے چھابڑی لگائی تو بار بار اسے پولیس کے چالان کا شکار ہونا پڑا۔ اور بالآخر ایک دن تنگ آکر اس نے زہر کی پڑیا پھانک لی۔ طلوع اسلام نے اخبارات کے حوالوں سے پہلے خودکشی کی یہ تفصیل پیش کی۔ اور پھر اپنے معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر خون جگر کو صفحۂ قرطاس پہ بکھیر دیا۔ اس نے لکھا ـــ

> یہ سب اپنی جگہ حق بجانب ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے کہ جن حالات سے مجبور ہو کر شہاب الدین اس اقدام پر مجبور ہو گیا اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یقیناً شہاب الدین نہیں۔ اگر خودکشی جرم ہے تو معاشرہ اپنے ایک فرد کو اس جرم کے ارتکاب پر مجبور کر دیتا ہے کیا وہ بھی برابر کا مجرم نہیں؟ لیکن شہاب الدین سے مواخذہ کرنے والے تو کئی ہیں۔ اس مجرم معاشرہ سے سوال کرنے والا کوئی نہیں۔ یاد رکھئے جس نظام میں معاشرہ سے مواخذہ کرنے والا کوئی نہ ہو وہ نظام، اسلامی تو ایک طرف انسانی بھی نہیں کہلا سکتا۔ (شمارہ فروری ۱۹۵۶ء - صفحہ ۳۴)

فریبِ نفس کی خطرناک کیفیت

اپریل ۱۹۵۶ء میں بھارتی وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے حسبِ سابق (اور حسبِ عادت بھی) ایک اخباری بیان میں کشمیر میں رائے شماری کرنے کے فیصلوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بھارتی وزیرِ اعظم کی طرف سے اس قسم کی حرکت پہلی بار سرزد نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ اس عیارانہ پالیسی کا شاخسانہ تھی جس پر بھارت عمل پیرا چلا آ رہا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ پنڈت جی کے اس بیان پر پاکستان میں جوش و خروش کا ایک ایسا طوفان یک بیک اٹھ کھڑا ہوا گویا پنڈت نہرو نے زندگی میں پہلی بار اس قسم کی ہرزہ سرائی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہوئے مئی ۱۹۵۶ء کے مقالۂ افتتاحیہ میں طلوعِ اسلام نے پاکستان کے عوام اور خواص دونوں کو ان کی ذمہ داریوں سے یوں خبردار کیا۔۔۔

> سوال یہ ہے کہ کیا نہرو نے پہلی بار ایسا کہا ہے جو اس کا بیان ہمارے لئے اس درجہ باعث تعجب اور وجۂ اضطراب ہو رہا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ [illegible] حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اس آٹھ سال میں اس کے متعلق جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اسے عوام نے اس قدر جلد فراموش کر دیا ہو۔ ہندوستان پاکستان کے متعلق جو کچھ کر رہا ہے ایک متعین پالیسی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق کر رہا ہے۔ کشمیر کے متعلق اس نے پہلے دن سے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے جوناگڑھ، مناور اور حیدرآباد کی طرح ہتھیا لے گا۔ لیکن یہ ذرا سخت ہڈی تھی اس لئے اسے ہضم کرنے میں اسے دقت درکار تھا۔ اس آٹھ سال میں اس کی تمام حیلہ تراشیاں اور بہانہ سازیاں اسی مقصد کے حصول کے لئے تھیں۔ اقوامِ متحدہ کی طرف مراجعت، ایڈمنسٹریٹر کا تقرر اور تعطل، سیکیورٹی کونسل، باہمی مذاکرات سے معاملہ کا تصفیہ، تقسیم کی تجویز اور استصواب وغیرہ سب خواب آور دوائیاں تھیں جو وہ یکے بعد دیگرے پاکستان کو کھلاتا چلا گیا۔ لیکن اس کے یہ عزائم ایسے گہرے اور دبیز پردوں میں چھپے ہوئے نہیں تھے جو دیکھنے والوں کو نظر نہ آ سکے۔۔۔

جو کچھ کر رہا تھا اسے اندھے بھی دیکھ سکتے اور بہرے بھی سن سکتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم اس کی ظاہر داری اور دیانت داری کے فریب میں آ گئے اور ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے دلی ارادے کیا ہیں؟ البتہ فریبی نہیں تو فریب نفس ضرور ہے۔ ہمارے ہاں سب جانتے تھے کہ ہندوستان کے عزائم کیا ہیں؟ اور وہ کس طرح مرورِ زمانہ سے اپنی تقویت کا سامان بہم پہنچاتا چلا جا رہا تھا۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا تو اس قسم کی سطحی نگاہ رکھنے والے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کو اپنی معصوم حماقت اور لفظانہ سادہ لوحی کی بھینٹ چڑھائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اہم عقدوں کے کشود کے لئے جس قسم کی مومنانہ فراست اور قلندرانہ جرأت درکار ہوتی ہے اس کا ہمارے ہاں فقدان تھا۔ لیکن اس کے کھلے کھلے اعتراف کی بجائے ہمارے ذمہ دار حضرات میں سے ہر ایک کی کوشش یہی رہی کہ کسی نہ کسی طرح بات ٹلتی رہے تاکہ یہ قضیہ اس کے وقت میں نہ اٹھے۔ کسی اور کے زمانہ میں الجھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہم آج اس مقام پر لاکر کھڑے کر دئے گئے ہیں جہاں نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کا روح فرسا منظر کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ (شمارہ مئی ۵۶ء صفحہ ۲-۳)

ہماری منصوبہ بندی کا پہلا شاہکار

اپنے قومی مستقبل کی تعمیر و ترقی کے لئے منصوبہ بندی کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اپنی نوزائیدہ مملکت میں ہمارے کارفرماؤں نے پورے نو سال کسی منصوبہ بندی کے بغیر ہی پورے کر لئے۔ خدا خدا کر کے جون ۵۶ء میں پہلی بار پلاننگ بورڈ کی طرف سے پہلی پانچسالہ منصوبہ بندی کا مختصر مسودہ منظرِ عام پر آیا۔ جولائی ۵۶ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں طلوع اسلام نے اس مسودہ کا بھرپور جائزہ لیا اور تعمیری نقطۂ نظر سے اس کے مختلف گوشوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے اس کی خامیوں کی پوری پوری نشاندہی کی۔

دیہی اصلاح کے اہم مسئلہ سے متعلق اس مسودہ میں امریکی اسکیم کا تتبع اختیار کیا گیا تھا۔ اس طریقِ کار سے اختلاف کرتے ہوئے طلوع اسلام نے واضح کیا کہ

> امریکی اسکیم اپنے حالات کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ اس اسکیم کو اگر ہم اپنے ہاں کے دیہات میں رائج کرنے بیٹھ جائیں تو اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے اس سے پیشتر ہم نے (مغرب ہی کی نقالی میں) اپنے دیہات میں امدادِ باہمی (کوآپریٹو سوسائیٹیز) کی اسکیم کو جاری کر کے دیکھ لیا ہے کہ وہ کس درجہ ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں دیہات سدھار

اور پنچایت کی اسکیمیں جس بُری طرح فیل ہوئی ہیں وہ تجربہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اب انہی خطوط پر دیہی امداد کی اسکیم کو رائج کرنا آزمودہ را آزمودن کے سوا اور کیا ہے؟ ہمیں امریکہ سے روپیہ تو مفت مل گیا لیکن اس روپے کے موزوں اور نتیجہ خیز مصرف کے لئے ذہنی کاوش اور فکری جہد کی ضرورت تھی لیکن ہمارے ہاں اس قسم کی کاوش اور محنت کون کرے۔ ہم نے ایک منسٹری قائم کر لی اور یہ روپیہ اس کے حوالے کر دیا۔ اب اس کا کام یہ ہے کہ اس روپے کو کسی نہ کسی صورت ختم کرے۔ وہ روپیہ ختم کر رہی ہے۔ باقی رہا نتیجہ سو وہ (مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق) خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ انسان اس میں کیا کر سکتا ہے؟ انسان کانفرنسیں منعقد کر سکتا ہے۔ بیانات دے سکتا ہے۔ شاندار رپورٹیں مرتب کر سکتا ہے۔ سو اس باب میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ (شمارہ جولائی ۵۶ء صفحہ ۳)

اس گہری تنقید سے کام لیتے ہوئے اس نے اربابِ اقتدار کو اس حقیقت کا احساس دلانے کی کوشش کی کہ ـــ

معاف کیجئے! یہ کام منسٹری کے ٹھنڈے کمروں میں نرم و نازک کرسیوں پر بیٹھنے والوں کے بس کا نہیں۔ یہ کام ان "دیوانوں" کا ہے۔ جو دل میں انسانیت کا درد لئے مئی اور جون کی چلچلاتی دھوپ اور نومبر اور دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں گاؤں گاؤں پھریں۔ ایک ایک شخص کی حالت کا مطالعہ کریں۔ دیہاتیوں کی زندگی اور ان کی مشکلات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں۔ ان کے اندر رہیں اور ان ہی جیسی زندگی بسر کریں۔ اور اس کے بعد سوچیں کہ ان کی مصیبتوں کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ دیہی امداد کا روپیہ صرف اسی طرح نتیجہ خیز ہو سکتا ہے نہ کہ اس صورت میں جس میں یہ اب صرف ہو رہا ہے۔ اس سے کون سے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے؟

جنوں نداری و ہوئے فگندہ در شہر
سبو شکستی و بزمِ شبانہ می خواہی؟

ان اسکیموں سے متعلقہ افسر جس انداز سے گاؤں میں جا کر جلسے کرتے اور کھیل تماشے رچا کر واپس آ جاتے ہیں اسے دیکھ کر ان گاؤں والوں کی مفلسی و زبوں حالی ایک استہزا آمیز ہنسی ہنستی اور ان مشفقینِ کرام سے پوچھتی ہے کہ

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری　　تب و تابِ ما شناسی؟ دلِ بے قرار داری؟
چہ خبر ترا ز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے　　تو بہ برگِ گل ز شبنم ز بسا ہوا روا داری؟

ہمارے دیہات کی حالت جس نازک ترین مرحلے تک پہنچ چکی ہے اس کے اگلے قدم کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے لیکن ہمارے اربابِ نظم و نسق ان طوفانوں کا مقابلہ کاغذی ناؤ سے کرنا چاہتے ہیں۔ و ما

يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۔ (ایضاً)

تعلیمی انقلاب کی ضرورت

منصوبہ بندی کے منصوبے میں تعلیم اور نصابِ تعلیم کے بارے میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے بعض اہم اور بنیادی نکات کی نشاندہی کرتے ہوئے اسی مقالہ میں آگے چل کر بتایا۔

اگر کسی نے اس بات کا اندازہ لگانا ہو کہ کسی قوم کا مستقبل کیا ہے تو اسے دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس قوم کے تعلیمی ادارے کیسے ہیں۔ یہی وہ کارگاہ ہے جہاں قوم کے مقدرات کے ستارے ڈھلتے ہیں جس قسم کی کسی قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت ہو گی اسی قسم کا اس کی آئندہ نسلوں کا کردار و عمل ہو گا۔ ہم نے اس ۱۶ سال کے عرصے میں جو سب سے بڑا قومی جرم اور انسانیت کا گناہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے بُری طرح اعراض برتا ہے۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے قوم کے بچوں کا پچاس فی صدی حصہ محض سکولوں میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر رہا۔ جہاں تک نصاب کا تعلق ہے حالت اس سے بدتر ہے۔ انگریز جس قسم کا نصاب ہمیں ورثہ میں دے گیا تھا وہی ابھی تک ہماری درسگاہوں میں رائج ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس کے معیار میں اب خاصی پستی آچکی ہے اور یہ ترقی معکوس ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ (ایضاً صـ)

ہمارا نصابِ تعلیم کس نوعیت کا ہو اس کی وضاحت کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

جہاں تک عصرِ حاضر کے علوم کی تعلیم کا تعلق ہے اس کے لئے ہم یقیناً مغرب کی اعلیٰ درسگاہوں کے نصاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس تعلیم کی ہے جو ہمارے بچوں کے قلب و نگاہ کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال سکے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہماری مملکت کے اسلامی ہونے کا کچھ بھی مطلب نہیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم اور سیرتِ نبی اکرمؐ کی تعلیم ناگزیر ہے۔ قرآن کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں سمجھا جائے اور اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت سامنے لایا جائے کہ انسانی زندگی کے جن بنیادی مسائل کو تنہا عقلِ انسانی حل نہیں کر سکی نہ کر سکتی ہے۔ قرآن کریم ان مسائل کا حل کیا بتاتا ہے۔ اور حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کی تعلیم سے مطلب یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن کریم جس قسم کے انسانی معاشرے کا تصور دیتا ہے حضورؐ نے اسے کس طرح متشکل فرمایا اور اپنے زیرِ تربیت انسانوں کے دل و دماغ میں وہ تبدیلی کس طرح سے پیدا کی جس سے وہ سیرت و کردار کی بلند ترین سطح تک پہنچ گئے۔ (ایضاً)

اس کے بعد اس نے بتایا کہ

> جب تک ہم فرسودہ اور پامال راہوں سے ہٹ کر اپنے تیشہ سے اپنا جادہ آپ نہیں تراشیں گے۔ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ زیرِ نظر پلان میں ہمیں جدتِ نظر اور ندرتِ فکر کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ وہی پرانی لکیریں ہیں جنہیں مزید گہرا اور وسیع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ اس حقیقت کا اطلاق زندگی کے تمام شعبوں پر ہوتا ہے لیکن تعلیم کے سلسلے میں کورانہ تقلید ہمیں کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔ زیرِ نظر پلان میں جو کچھ تجویز کیا گیا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ تعلیم کی مد میں جس قدر روپیہ اس وقت ضائع ہو رہا ہے اس میں پچاس ساٹھ کروڑ کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ جو مسافر غلط راستے پر چل رہا ہو اگر اسے تانگے کی جگہ موٹر میں بٹھا لیا جائے تو کیا اس کا نام ترقی اور نیل المرام (ACHIEVEMENT) ہوگا (ایضاً)

اگست سنہ ۱۹۵۶ء میں پلاننگ بورڈ کی پانچ سالہ منصوبہ بندی کا یہ مسودہ پوری تفصیل سے (دو ضخیم جلدوں میں) شائع ہوا اور ستمبر ۵۶ء کے طلوعِ اسلام میں اس مسودہ کے زرعی اصلاحات سے متعلق باب کا (مسئلہ کی عالمگیر اہمیت کے پیشِ نظر) تجزیہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک اصولی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

> سوال یہ ہے کہ جب ہم اپنے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے بیٹھیں تو کیا ہمیں بھی وہی انداز و طریق اختیار کرنا چاہیئے جو دنیا کی دوسری قومیں اپنے ہاں کرتی ہیں یا ہم میں اور ان میں کوئی فرق ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہم میں اور ان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل خالص فکری انداز سے "اپنے مصالح کے پیشِ نظر" دریافت کریں گے لیکن ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ مسئلہ زیرِ غور کے متعلق خدا کی راہ نمائی کیا کہتی ہے اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے (اور اس ایمان کو ہم نے اپنی مملکت کے آئین میں بھی داخل کر لیا ہے) کہ ہمیں فضا کی پہنائیوں میں بے محابا اڑان پرواز نہیں بلکہ ہمارا رشتہ ایک خاص مرکز سے بندھا ہوا ہے۔ اور ہم کسی حالت میں بھی اس مرکز سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ... پلاننگ بورڈ کو یہی روش زمین کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بھی اختیار کرنی چاہیئے تھی یعنی اسے بنیادی طور پر یہ دیکھنا چاہیئے تھا کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور پھر اس کی روشنی میں یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ روش اختیار نہیں کی۔ ان کی رپورٹ میں چین، جاپان، امریکہ، افریقہ وغیرہ کے نظائر و امثال تو موجود ہیں لیکن قرآن کا کسی جگہ بھی ذکر نہیں آتا۔ کہا جائے گا کہ بورڈ کے ارکان اتنی استعداد نہیں رکھتے کہ قرآن سے راہ نمائی لے سکتے۔ ایسا ہو سکتا ہے لیکن جب انہوں نے دنیا کے گوشے گوشے سے مختلف نوعیتوں کی اطلاعات اکٹھی کرنے کی کوشش کی تو قرآن کے متعلق اتنی سی معلومات حاصل کرنے میں کیا مشکل تھی۔ قرآن سے راہ نمائی کے بعد مسائل کے تعین میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ (شمارہ نمبر ۵۶ء ص۲۳)

وحدتِ دین اور وحدتِ اُمت

چوہدری محمد علی کی وزارت کے بعد حسین شہید سہروردی برسرِ اقتدار آئے۔ مُلک سیاسی پارٹیوں کی ہوسِ اقتدار کا اکھاڑہ بن رہا تھا اور ملک و ملت کی وحدت اور استحکام شدید خطروں سے دوچار۔ اس صورتِ حال کی روشنی میں نئے وزارتی انقلاب پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوع اسلام نے اکتوبر ۱۹۵۶ء کے لمعات میں لکھا۔

ملک کی بساطِ سیاست پر پھر ایک تبدیلی نمودار ہو گئی ہے۔ ایک وزارت چلی گئی اور اس کی جگہ دوسری وزارت قائم ہو گئی۔ ہمیں نہ اس کا غم ہے نہ اس کی خوشی۔ جیسا کہ ہم شروع سے لکھتے چلے آ رہے ہیں، ملک کی نجات وزارتوں کی تبدیلی سے نہیں ہو سکتی۔ جب تک ملک میں سیاسی پارٹیاں موجود ہیں اور جب تک مذہبی فرقوں کا وجود قائم ہے نہ قوم کو کامیابی اور کامرانی نصیب ہو سکتی ہے اور نہ اسلام کے پنپنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تک ہم اس حقیقت پر ایمان نہیں لے آتے کہ ملتِ اسلامیہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں بجائے خویش ایک پارٹی ہے اور اس کے اندر فرقوں اور پارٹیوں کا وجود افتراق کی ابلیسی لعنت اور قرآن کے الفاظ میں شرک۔ اس وقت تک فلاح و بہبود کی طرف ہمارا کوئی قدم نہیں اُٹھ سکتا۔ لیکن پارٹیوں کے مٹ جانے سے ہمارے سیاسی لیڈروں کی سیادت مٹ جاتی ہے ۔۔ اور فرقوں کے ختم ہو جانے سے مذہبی رہنماؤں کی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اس لئے ان دونوں کی کوشش یہی رہتی ہیں کہ وہ مٹیں نہ یہ ختم ہوں۔ اس کے باوجود یہ توقع رکھنا کہ قوم اُبھر گئی اور اسلام زندہ ہو جائے گا۔ خود فریبی نہیں تو ابلہ فریبی ضرور ہے۔ ایک دین اور ایک امت ۔ یہ ہے اسلام کا اصل الاصول۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی ست

(شمارہ اکتوبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۵)

بھارتی مسلمان اور ہماری ذمہ داری

بھارت میں اسلام کی توہین، مسلمانوں کی دلآزاری اور ان کی اسلامی غیرت کے خلاف تشدد کا جو سلسلہ پہلے سے جاری تھا اس میں ایسے مذموم لٹریچر کی اشاعت بھی شامل تھی جس میں حضور رسالتمآبؐ کی شانِ اقدس و اعظم میں دریدہ دہنی سے کام لیا گیا۔ ایسی ہی ایک کتاب کی اشاعت پر بھارت کے مسلمانوں کے دل خون ہو کر رہ گئے۔ اور جب ان مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی اس گستاخی کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی تو ان پر حاکمانہ جبر و تشدد کی فرعونی روش حرکت میں آگئی۔ طلوع اسلام نے اس صورتِ حال پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے حکومتِ پاکستان اور ملتِ پاکستان کو اس کا فریضہ یاد دلایا اور لکھا ۔۔

..... ہمیں اس باب میں بھارت کی حکومت سے کچھ نہیں کہنا۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ اسے قوت کے نشے میں اس کا ہوش ہی نہیں کہ انسانیت کسے کہتے ہیں اور شرافت کس جنس کا نام ہے۔ ہمیں کچھ کہنا ہے تو خود حکومت پاکستان اور یہاں کے مسلمانوں سے۔ حکومت سے یہ کہ آپ نے تشکیل پاکستان کے وقت، ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ کیا آپ کو اپنے وعدہ کا اتنا ہی پاس ہے؟ کیا آپ کو اس کا علم نہیں کہ وہاں کے مسلمان جب اس ننگ انسانیت کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں حضور ختمی مرتبت کی شان میں گستاخی کی گئی ہے تو ان پر پاکستان کے حامی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے؛ اور اسی الزام میں انہیں دھر لیا جاتا ہے۔ کیا آپ کو اتنا بھی احساس نہیں کہ جن مظلوموں کو آپ سے نسبت دے کر موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ آپ کو ان کے ساتھ کس قدر تعلق رکھنا چاہیئے ..... کیا آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اقوام عالم کے مختلف اداروں میں بھارت کے شرمناک اور وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں؟ کیا آپ دنیا کو یہ نہیں بتا سکتے کہ وہاں کی اقلیت کے ساتھ یہ کیا سلوک ہو رہا ہے؟ (شمارہ اکتوبر سنہ ۵۶ء - صفحہ ۶)

امید کی کرن، عوام

اور پھر ملت پاکستان کی غیرت کو جھنجھوڑتے ہوئے اس نے مسلمانان پاکستان کو بایں الفاظ مخاطب کیا۔

اور یہاں کے مسلمانوں سے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے دور غلامی میں تو آپ کی یہ حالت تھی کہ اگر سمرنا کے کسی یتیم کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا تو ہندوستان کے شہروں اور گاؤں میں آپ پر راتوں کی نیند حرام ہو جایا کرتی تھی۔ کیا اس کے بعد اس آزادی کا یہی اثر ہے کہ آپ کی دیوار کے سائے میں ہندوستان کے مسلمانوں پر اس قدر بے پناہ مظالم ہو رہے ہیں اور آپ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر آزادی کا یہی اثر ہے تو اس آزادی سے وہ غلامی ہزار درجے اچھی تھی جس میں دلوں میں اسلام کی غیرت اور مظلوموں سے ہمدردی کے جذبات موجزن رہتے تھے۔ کیا آپ وہی نہیں جو اس دور محکومی میں ناموس رسالت کے تحفظ کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دیا کرتے تھے۔ اب آپ کی حمیت کو کیا ہو گیا؟ یا آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہندوستان میں جو گستاخی ہوئی ہے وہ "وہاں کے مسلمانوں کے رسول" کے خلاف ہوئی ہے۔ ہمارا اس سے کچھ واسطہ نہیں! یہ ان کا مقامی مسئلہ ہے اگر آپ کا احساس (ریاسی حس) کا یہی عالم ہے تو اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ جو دل ناموس رسالت کے تحفظ اور مظلوموں

کی امداد کے لئے دھڑکتا نہیں، اس کی حرکت جتنی جلدی بند ہو جائے، اچھا ہے۔ (ایضاً)

اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ کے نہر سویز اور مصر پر حملے سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی وہ مسلمانانِ عالم کے لئے عبرت اور موعظت کی ایک داستان اپنے دامن میں لئے ہوئے تھی۔ صورتِ حال کے تقاضوں کو منظرِ عام پر لاتے ہوئے طلوعِ اسلام نے ایک اہم تاریخی حقیقت سے یوں نقاب اُلٹا۔

> انگریز اس سے پہلے، اس قدر عریاں ہو کر کبھی میدانِ سیاست میں نہیں آیا تھا۔ مصلحت کوشی، نقاب پوشی، نرم روی، آہستہ خرامی اس کی قومی خصوصیات تھیں۔ اب معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی ان قومی روایات سے بھی عاری ہو چکا ہے۔ گزشتہ عالمگیر جنگ کے بعد وہ اول درجہ کی قوتوں کی صف سے دھکیل کر باہر نکال دیا گیا ہے۔ اب وہ سیاسی میدان میں بھی بڑے ذلیل اور پست مقام پر پہنچ گیا ہے۔ ان قوموں کا بھرم جتنی جلدی کھل جائے اچھا ہے۔ تاکہ وہ فریب جسے انسانیت نے ان کے ہاتھوں کھایا ہے اس کا پردہ چاک ہو جائے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ محکم بنیادیں کون سی ہیں جن پر انسانی تہذیب و تمدن کی بنیاد استوار ہونی چاہیئے۔ جس دن انسان نے یہ سوچنا شروع کر دیا وہ زندگی کے صحیح راستے کے بہت قریب آ جائے گا۔
>
> (لمعات شمارہ دسمبر سنہ ۵۶ء - صـ۳)

یہ تو تھا انگریز اور انسانیت سے متعلق ایک عبرت انگیز پہلو۔ اس کے بعد طلوعِ اسلام، مسلمانانِ عالم کو زندگی کے اہم تقاضوں سے یوں خبردار کرتا ہے۔

> مصر کا حادثۂ فاجعہ اگر مسلمانانِ عالم کو اپنی حالت پر غور کرنے کے لئے آمادہ کر دے تو اس کی یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں ہوگی۔ ذرا سوچئے کہ اگر مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے علاقے میں پھیلی ہوئی یہ قوم کہیں امتِ واحدہ بن جائے تو ان کی قوت کیا سے کیا نہ کر دے! اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں عرب نسل پرستی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ اس سے پیچھے ہٹئے تو انہیں وطنیت کی چاردیواریاں ٹکڑے ٹکڑے کئے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مفاد پرستیاں انہیں ایک دوسرے کا حریف بنائے ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں تو لڑتے اور غیر مسلموں سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ کہیں عرب لیگ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ہم اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے وائس پریذیڈنٹ کے انتخاب کے سلسلے میں بھارت کے امیدوار کی حمایت کریں گے۔ کہیں جمال ناصر اعلان کرتے ہیں کہ چونکہ ہم اپنے شہر کی دیکھ بھال جلد شتان کے نمائندے کے سپرد کرتے ہیں۔ ادھر پاکستان سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ کہیں پان اسلام ازم کے

بجائے "پاک اسلازم" کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ کوئی روس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کوئی اپنا رُخ
امریکہ کی طرف کئے ہوئے ہے۔ اور تشتت انتشار کا یہ عالم اس قوم کا ہے جس کا ایمان ہے اِنَّمَا
الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹/۱۰) سوچئے کہ اگر ان الفاظ کو ثواب کی خاطر دہرانے کے بجائے اس قوم کا
فی الواقعہ اس پر ایمان ہو جائے تو آج کس طرح دنیا کا نقشہ بدل جائے! (ایضاً۔ صفحہ ۳)

مفکرِ قرآن کی تحقیقِ مسلسل اور کاوشِ پیہم
کا بے مثال شاہکار
اِنسان نے کیا سوچا؟
عہدِ افلاطون سے لے کر عصرِ حاضر تک انسانی فکر کن دشوار گزار مرحلوں کو طے کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی
ایک عبرت آموز روئیداد ——— ایک علم افروز داستان ——— ایک بصیرت انگیز تجزیہ
ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین :- فاضل مصنف چوہدری غلام احمد
پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین کیلئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اس کی افادیت اور
مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلبا کیلئے اس کا مطالعہ زیادہ وسیع ہونا چاہیئے • ——— (پاکستان ٹائمز لاہور)
یہ کتاب نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔۔۔ صفحات کی یہ کتاب ہزاروں
کتابوں کا نچوڑ ہے ——— • (قندیل ویکلی - لاہور) ———
(قیمت ۱۲ روپے)
میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

تحویلِ قبلہ

ایک اتوار کو پرویز صاحب نے اپنے درسِ قرآن میں، تحویلِ قبلہ کے متعلق وضاحت سے بیان کیا تھا۔ بہتر ہو کہ اگر سارا درس نہیں تو کم از کم اس نکتہ کو طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے تاکہ عام طور پر پھیلی ہوئی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔" (ایک دوست کا مشورہ)

تحویلِ قبلہ کے متعلق ہماری کتبِ روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں، بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ مدینہ تشریف لانے کے بعد بھی قریب سولہ سترہ ماہ تک حضورؐ اُسی طرف رُخ کرتے رہے۔ ازاں بعد، خدا نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا اور نمازوں میں رُخ اس طرف ہونے لگا۔

روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب آپؐ مکہ میں تھے تو آپؐ نماز میں اپنا رُخ اس طرح رکھتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس ایک ہی سیدھ میں آجائیں۔ مدینہ میں آنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا۔ وہاں یا بیت المقدس کی طرف رُخ کیا جا سکتا تھا یا کعبہ کی طرف۔ حضورؐ کی آرزو یہ تھی کہ بیت المقدس کی جگہ مسلمانوں کا قبلہ، کعبہ مقرر ہو جائے۔ اس کے لئے آپؐ رہ رہ کر آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اس آرزو کو پورا کیا اور کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے پہلے بیت المقدس کو بھی خدا ہی نے قبلہ مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد خدا نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ کر کے، کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا۔ وحیٔ غیر متلو کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی لائی جاتی ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ خدا نے مسلمانوں کے لئے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تھا۔ یہ حکم قرآن کریم کے اندر نہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حضورؐ کی طرف ایسی وحی بھی آتی تھی جو قرآن میں درج نہیں۔

تحویلِ قبلہ کے متعلق روایات میں، مختلف بیانات آئے ہیں، ان میں اس بیان کو ترجیح دی جاتی ہے کہ مدینہ میں ظہر (یا عصر) کی نماز باجماعت ادا ہو رہی تھی۔ حضورؐ امام تھے اور صحابہؓ (اور صحابیاتؓ) مقتدی۔ سب کا رُخ جانبِ بیت المقدس تھا۔ جب دو رکعتیں ادا ہو چکیں، تو تحویلِ قبلہ کا حکم آیا۔ کعبہ بیت المقدس سے بالکل مخالف سمت میں واقع تھا اس لئے نبی اکرمؐ پورا چکر کاٹ کر مخالف سمت کی طرف تشریف لے آئے۔ آپؐ کے پیچھے پیچھے صحابہؓ بھی اسی

طرح دوسری طرف آ گئے، اور عورتیں سب سے پچھلی صف میں چلی گئیں۔ اس طرح نماز کی باقی دو رکعتیں پوری کی گئیں۔

یہ ہے مختصراً تحویلِ قبلہ کا وہ بیان جو روایات میں ملتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم قرآنِ کریم کی طرف آئیں، یہ دیکھئے کہ اس بیان کی رُو سے خود حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے۔ بیت المقدس خدا کے حکم سے قبلہ مقرر ہوا تھا۔ رسولؐ سے بڑھ کر، احکامِ خداوندی کا اطاعت گزار اور کون ہو سکتا ہے؟ اور اطاعت کے معنی ہیں، دل کی پوری رضامندی سے حکم کی تعمیل کرنا۔ اگر خدا کے حکم کے خلاف دل میں کوئی اور جذبہ یا آرزو اُبھر آئے تو اسے اطاعت نہیں کہا جائے گا۔ لیکن روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ جب حضورؐ مکہ میں تھے، تب بھی آپ کا جی یہی چاہتا تھا کہ مسلمانوں کا قبلہ کعبہ ہی ہو۔ حضورؐ اپنے اس جذبہ کی تسکین یوں فرما لیتے تھے کہ نماز میں اپنا رخ اس طرح متعین فرماتے کہ کعبہ اور بیت المقدس ایک ہی سیدھ میں آ جائیں۔ اس طرح خدا کے حکم کی تعمیل بھی ہو جاتی تھی اور اپنے جذبہ کی تسکین بھی۔

غور فرمائیے کہ اس سے (معاذ اللہ) بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ مدینہ میں اگر جب یہ شکل ممکن نہ رہی تو آپؐ حکمِ خداوندی کی تعمیل میں اپنا رخ تو جانبِ بیت المقدس کر لیتے تھے لیکن ہمیشہ آسمان کی طرف تکتے تھے کہ کسی طرح یہ حکم بدلا جائے اور کعبہ ہی قبلہ مقرر ہو جائے۔ آپ سوچئے کہ جب خدا ایک بات کا فیصلہ کر دے تو رسولؐ کے دل میں، اس کے خلاف کوئی آرزو پیدا ہو سکتی ہے؟ خدا کے مقرب بندوں کی تمام آرزوئیں، جذبات اور خواہشات، خدا کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ اور اس باب میں رسولؐ سے بڑھ کر اور کس کا مقام ہو سکتا ہے؟ کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ خدا کا حکم تو یہ ہو کہ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بناؤ اور رسولؐ اللہ کی آرزو یہ ہو کہ قبلہ، کعبہ مقرر ہو جائے۔ اور پھر اس شدتِ آرزو کے پیشِ نظر، خدا اپنا پہلا حکم واپس لیکر، کعبہ کو قبلہ مقرر کر دے۔

چونکہ یہ چیز حضورِ رسالت مآبؐ کی شانِ اقدس و اعظم کے خلاف جاتی ہے، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ روایات صحیح نہیں۔

اگر بیت المقدس کو خدا نے قبلہ مقرر نہیں کیا تھا، یہ حضورؐ کا اپنا انتخاب تھا، تو اوّل تو یہی بات قرینِ قیاس نہیں کہ حضورؐ کعبہ کو چھوڑ کر بیت المقدس کو اپنا قبلہ مقرر فرماتے۔ حضورؐ مکہ میں پیدا ہوئے۔ عام عربوں کے نزدیک کعبہ کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی، وہ سب پر عیاں ہے۔ پھر نبوّت کے بعد، حضورؐ کی دعوت ملّتِ ابراہیمیؑ کی طرف تھی، اور کعبہ کی تعمیر خود حضرت ابراہیمؑ کے مقدّس ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے بھی، کعبہ کی حُرمت واضح تھی۔ جب تک آپؐ مکہ میں رہے، کعبہ کا حج کرتے رہے (حالانکہ ابھی حج فرض نہیں ہوا تھا) بیت المقدس کی زیارت کے لئے بھی آپؐ تشریف نہیں لے گئے۔ اندریں حالات، یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ حضورؐ، مکہ کو چھوڑ کر بیت المقدس کو اپنا قبلہ تجویز فرماتے۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ انتخاب، خود حضورؐ کا اپنا تھا۔ خدا کے حکم سے نہیں ہوا تھا، تو پھر بیت المقدس کی جگہ، کعبہ کو قبلہ بنانے کے لئے خدا کے حضور اپنی آرزوئیں پیش کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ حضور اپنا فیصلہ جس وقت

چاہتے آپ بدل سکتے تھے۔[1]

اب آپ قرآنِ کریم کی طرف آیئے۔ قرآنِ کریم میں کہیں مذکور نہیں کہ حضورؐ پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اور بعد میں کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے تھے۔ قرآنِ کریم کی جس آیت سے "تحویلِ قبلہ" کی دلیل لائی جاتی ہے وہ سورۃ البقرہ کی آیت ۲/۱۴۲ ہے۔ یعنی وہ آیت جس سے دوسرا پارہ شروع ہوتا ہے۔ (سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ......) اس کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے "بے وقوف لوگ اب کہیں گے کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو اُن کے قبلے سے جس پر وہ تھے"۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، یہ ترجمہ ان روایات پر مبنی ہے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے — اور صحیح نہیں۔

قرآنِ کریم کے پہلے پارے کو دیکھئے۔ اس میں عمودی موضوع یہ ہے کہ اہلِ کتاب (بالخصوص یہود) کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ دین شروع سے اخیر تک ایک ہی چلا آرہا ہے۔ یہی دین، حضرت ابراہیمؑ کو دیا گیا تھا۔ اور یہی حضرت موسٰیؑ اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کو۔ لیکن تم نے اس میں اپنے خود ساختہ عقائد و تصورات شامل کر دیئے۔ حقیقی دینِ خداوندی کی خصوصیتِ کبرٰی یہ تھی کہ اس کا خطاب عالمگیر انسانیت سے تھا۔ تم نے اسے نسلی اور قومی بنا دیا اور فوز و فلاح اور نجات و سعادت کو بنی اسرائیل کی نسل میں محدود کر دیا۔ یہ دین (جیسے محمد رسول اللہؐ کی طرف وحی کیا گیا ہے) اُسی عالمگیر دعوت کا نقیب ہے۔ تم اپنی گروہ بندانہ ذہنیت کو ترک کر کے اسے اختیار کرو۔

آپ دیکھیں گے کہ سلسلۂ کلام شروع سے اخیر تک یہی چلا آرہا ہے۔ یہود اس کے خلاف اعتراضات کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ اگر یہ دین وہی ہے جو ان کے انبیاءؑ کی طرف آیا تھا تو اس کے لئے ایک نئی کتاب (قرآنِ کریم) کی کیا ضرورت تھی۔ کبھی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن نے ان چیزوں کو حلال کیوں قرار دیدیا جو ان کے ہاں حرام تھیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ سلسلۂ وحی شاخِ بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسمٰعیلؑ کی طرف کیوں منتقل ہوگیا۔ اسی سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ان کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ اگر یہ دین وہی تھا تو مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس ہونا چاہیئے تھا۔ انہوں نے اس کی جگہ کعبہ کو اپنا قبلہ کیوں مقرر کرلیا۔ یعنی یہ نہیں کہ مسلمانوں نے پہلے اپنا قبلہ بیت المقدس کو مقرر کیا تھا، اور اس کے بعد اس کی جگہ کعبہ کیوں مقرر کرلیا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ جب بیت المقدس قبلہ چلا آرہا تھا تو اس کی جگہ کعبہ کو قبلہ کیوں مقرر کیا گیا؟

---

[1] میں نے "معراجِ انسانیت" میں لکھا تھا کہ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب تک کسی معاملہ میں خدا کا حکم نہیں آتا تھا حضورؐ انبیائے سابقہ کی اقتدا کرتے تھے۔ لیکن مزید غور کرنے پر تحویلِ قبلہ کے متعلق روایات ہی صحیح نظر نہیں آتیں۔

پرویز۔

ہر نظام کا ایک مرکزی مقام ہوتا ہے۔ یوں تو وہ ایک مقام ہی ہوتا ہے۔ لیکن نظام کے مرکز کی حیثیت سے اسے خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ درحقیقت اس نظام کا ترجمان اور اس کی خصوصیات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں قوم نے لندن سے منہ موڑ کر ماسکو کی طرف رُخ کر لیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس نے ایک شہر کے بجائے دوسرے شہر کی طرف رُخ کر لیا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس نے نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ جمہوریت کی جگہ اشتراکیت کا نظام اختیار کر لیا، یا روس سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ دین کے نظام میں اس حقیقت کو "قبلہ" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، جس کے معنی ہیں پیشِ نہاد، نصب العین، وہ نقطۂ ماسکہ جسے ہر وقت آنکھوں کے سامنے رکھا جائے۔ جو کسی ملت کا مطمحِ نگاہ ہو۔ جو اس کے مسلک و مشرب کی ترجمانی کرے۔ یعنی جو اس قوم کا مرکزِ محسوس ہو۔ اسلام میں کعبہ کی یہی حیثیت ہے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کا مرکز ہے۔ یاد رہے کہ یہ جو ہم نمازوں میں کعبہ کی طرف رُخ کرتے ہیں، تو یہ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ ہے کہ ہمارے نظام کا مرکز کعبہ ہے، اور زندگی کے ہر گوشے میں ہماری نگاہیں ہمیشہ اس کی طرف اٹھیں گی۔ اس سے ساری دنیا کے مسلمانوں میں یک نگہی اور یک جہتی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اور وہ علی رؤس الاشہاد پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم کہیں بھی ہوں، ہمارا مرکز ایک ہے۔ ہم سب اسی کو اپنا مقصود و منتہیٰ سمجھتے ہیں۔ ہمارا "قبلہ" نہ لندن ہو سکتا ہے نہ ماسکو، نہ واشنگٹن ہو سکتا ہے نہ پیکنگ۔ ہمارا قبلہ صرف کعبہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہے "قبلہ" سے مراد اور یہ ہے نمازوں میں کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حقیقی مقصود۔

یہود کا قبلہ (بیت المقدس) ان کا قومی مرکز تھا۔ صرف بنی اسرائیل کا مرکز۔ اس کے برعکس کعبہ کے متعلق واضح طور پر بتا دیا گیا کہ وہ قوموں، نسلوں، وطنوں، فرقوں، گروہ بندیوں کی تمام خود ساختہ نسبتوں سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کا مرکز ہے۔ اُسے بنایا ہی اسی غرض کے لئے تھا۔ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا (۳/۹۶)۔ "وہ پہلا گھر جو (قومی نسبتوں سے بلند ہو کر خالص) انسانیت کے لئے بنایا گیا، یہ مکہ مبارک کا گھر ہے"۔ اس کی خصوصیت یہ ہے مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۳/۹۷) "جو اس میں داخل ہو گیا (کسے باشد) اسے امن حاصل ہو گیا۔" دوسری جگہ ہے۔ إِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا (۲/۱۲۵) اسے تمام نوعِ انسانی کا مرجع بنایا۔ سورۂ مائدہ میں ہے جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ (۵/۹۷)" اس مرکز سے وابستہ ہونے سے عالمگیر انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) "مکہ کے رہنے والے ہوں یا باہر کے باشندے۔ یہ مرکز سب کے لئے یکساں حیثیت رکھتا ہے۔" چونکہ یہ ہر قسم کی گروہ بندانہ نسبتوں سے بلند ہو کر، خالص انسانیت کا مرکز قرار پایا ہے اس لئے اسے خدا نے "اپنا گھر" (بَيْتِيَ) کہا ہے ——— یاد رکھئے! جو چیز عالمگیر انسانیت کے لئے وقف ہو، اُسے خدا "اپنی" کہہ کر پکارتا ہے۔ ——— اسی جہت سے کہا گیا کہ کعبہ میں جمع ہونے (حج) کے لئے تمام نوعِ انسانی کو دعوت دی جائے۔ وَأَذِّنْ

فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (۲۲/۲۷) لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸) "تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ نظامِ خداوندی کس طرح عالمگیر انسانیت کی منفعت بخشیوں کا ضامن ہے۔" دوسری جگہ ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (۳/۹۷) "النَّاس (عالمگیر انسانیت) کے لئے فریضۂ خداوندی ہے کہ وہ اس گھر میں جمع ہوں۔"

آپ نے غور کیا کہ قرآنِ کریم نے کعبہ کے عالمگیر انسانیت کے مرکز ہونے کو کس وضاحت سے بیان کیا ہے؟ اس کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں سے وجود کوش ہوئی تھی، جن کے متعلق فرمایا کہ۔ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (۲/۱۲۴) "میں تمہیں نوعِ انسانی کا امام بناؤں گا۔" یہاں پھر النَّاس کہا گیا ہے۔ اور جس امت کے سپرد کعبہ کی تولیت (نظم و نسق) کی گئی اس کے متعلق کہا کہ۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱۰) "تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔" اور تمہارا فریضہ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) ہونا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے اعمال کا نگراں ہونا۔

یہ تھا وہ جواب جو یہودیوں کو دیا گیا۔ یعنی تمہارا قبلہ تمہارا قومی مرکز ہے۔ اس کے برعکس کعبہ یومِ اوّل سے عالمگیر انسانیت کا مرکز بننے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ اب تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ جس دین کا خطاب عالمگیر انسانیت سے ہو، اس کا قبلہ (مرکزی مقام) کعبہ کو ہونا چاہیئے یا بیت المقدس کو؟

اس پس منظر میں قرآنِ کریم کی متعلقہ آیات کو لیجئے۔ بات صاف ہو جائے گی۔ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ "یہ لوگ جو محض اپنے جذبات کے پیچھے چلتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے (یعنی یہودی) وہ یہ اعتراض بھی کریں گے کہ جس قبلہ پر وہ (یہودی) ہیں، وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اس سے رُوگردانی اختیار کر کے، کعبہ کو اپنا قبلہ بنا لیا؟" آپ دیکھئے! اس میں سوال نماز کی سمت کا نہیں، اصل سوال اپنے لئے مرکز تجویز کرنے کا ہے۔ اور یہی یہود کا اعتراض تھا کہ مسلمانوں نے ہمارے مرکز کی جگہ کعبہ کو اپنا مرکز تجویز کیوں کر لیا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ:۔

(۱)۔ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (۲/۱۴۲) "خدا کے لئے ساری کائنات ہے۔" اس لئے جس دینِ خداوندی کو مشرق و مغرب کو اپنے آغوش میں لینا ہو، کیا وہ ایک خاص نسل یا قوم کے مرکز کو اپنا مرکز اختیار کرے گا یا عالمگیر انسانیت کے مرکز کو؟۔

(۲)۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) جس قوم کو بین الاقوامی ملت بننا ہو تاکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کر سکے، اس کا مرکز عالمگیر انسانیت کا مرجع ہونا چاہیئے یا صرف ایک قوم کا مرکز؟۔

(۳)۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ

مِمَّن يَّنقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيهِ (۲/۱۴۳) کعبہ کو تمہارا قبلہ تجویز ہی اسی لئے کیا گیا تھا کہ قومیت کی تنگ ذہنیت اور انسانیت کی عالمگیر ذہنیت رکھنے والوں میں امتیاز ہو جائے۔ اس رسولؐ کا پیغام عالمگیر انسانیت کا پیغام ہے، اس لئے جو لوگ عالمگیر انسانیت کے مسلک پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس رسولؐ کا اتباع کریں گے اور جن کے دل سے نسلی اور قومی تعصب کا جذبہ دور نہیں ہو سکا، وہ اس کے پیچھے نہیں چلیں گے۔

جب کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ (مرکز) مقرر کیا تو اس پر مشرکین کا قبضہ تھا۔ وہ ان کی تولیت میں تھا۔ اب ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین کے دل میں باربار یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا (اور ہونا بھی چاہیے تھا) کہ جس مقام کو ہمارے نظام کا مرکز بنایا گیا ہے اس پر قبضہ بھی ہمارا ہی ہونا چاہیے۔ اس کے لئے ارشاد ہوا کہ:۔ قَد نَرٰى تَقَلُّبَ وَجهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبلَةً تَرضٰىهَا (۲/۱۴۴) "جو خیال تمہارے دل میں باربار اٹھتا ہے وہ ہماری نگاہ میں ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ تمہاری آرزو کے مطابق ہم کعبہ کو ضرور تمہاری تولیت میں دیدیں گے۔ اس پر تمہارا ہی قبضہ اور نظم و نسق ہوگا۔" (اور یہ ہو کر رہا)

اس کے بعد متعدد آیات میں کہا گیا ہے کہ:۔ وَحَيثُ مَا كُنتُم فَوَلُّوا وُجُوهَكُم شَطرَهُ (۲/۱۴۴) یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کے کسی گوشے اور کاروبارِ زندگی کے کسی شعبے میں ہو، اپنی توجہات کا رُخ اپنے مرکز کی طرف رکھو۔ تمہاری کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ

پَرَد در وسعتِ گردوں یگانہ
نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

کائنات کی عالمگیر فضاؤں میں اُڑنے والی ملتِ اسلامیہ کا شاخِ آشیانہ "کعبہ" ہے جس کی طرف، ہر حال میں اس کی نگاہ رہنی چاہیے۔ اسی کو "قبلہ" کہتے ہیں۔ نمازوں میں اس کی طرف رُخ کرنا اس قلبی کیفیت کا عملی مظاہرہ ہے۔ نماز کی ساری ہیئت ہی قلبی کیفیات کا عملی مظاہرہ ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب قلبی کیفیات باقی نہ رہیں اور صرف عملی مظاہرہ، رسوم کی شکل میں باقی رہ جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

ضرورت اس کی ہے کہ "رسمِ اذاں" میں پھر سے "روحِ بلالیؓ" پیدا کر دی جائے، اور اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنِ کریم سے متعین کیا جائے کہ یہ رسوم، کس روح کی آئینہ دار تھیں۔ یہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہم جو اس وقت مٹی کی مورتیاں بن کر رہ گئے ہیں، کس طرح عقابی شان کے حامل ہو جاتے ہیں اور کس طرح یہ اعجازِ مسیحائی

حقیقتِ ثابتہ بن کر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ:۔

أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ (۳/۴۹)

اگر یک ذرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

جس جہانِ نو کا

تصور ہمارے زمانے میں علامہ اقبال نے پیش کیا اس کے خدوخال کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس مجموعہ کو دیکھیں جس میں

اقبال

اور

قرآن

بیک وقت آپ کے سامنے آجائے، قرآن کے حقائق اور اقبال کا بیان جن حقائق کا اس سے زیادہ دلکش مرقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

"اقبال اور قرآن"

ے جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا اس سے پہلے آپ نے کہیں نہیں دیکھا ہوگا۔ ــــ قیمت دو روپے (۲/۰)

میزان پبلی کیشنز لمیٹڈ ۔ ۲۷ ۔ بی ۔ شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

چہل حدیث

ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی، پی۔ ایچ۔ ڈی فاضل دیوبند، پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم یا فتاح یا مجیب۔ ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ قدرت ہی کو منظور نہ تھا کہ عہد رسالت میں احادیث نبویہ گو تدریجی رفتار ہی سے سہی کتابی شکل میں مدون ہو جائیں اور لوگوں کو اپنے اپنے مقلدوں کی خاطر اپنی تائید میں احادیث وضع کرنے کے مواقع ہاتھ نہ آتے اور کیا عجب ہے کہ اس کے ہی بعض آثار دیکھ کے اور سمجھ کے آپ نے اپنی ہی زبان مبارک سے اعلان فرما دیا تھا۔ من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بالارادہ یا بلا ارادہ کذب اور وضع کا شائع اور ذائع ہونا آسان تر ہوگیا تھا۔ بالخصوص جب فتوحات اسلامیہ میں وسعت ہوئی بربری، مصری، رومی، ایرانی آ آ کے اسلام میں داخل ہونے لگے اور آیات قرآنیہ کی تفسیر میں ان میں سے غیر محتاط اور نام نہاد مسلمانوں کے افراد نے وہ وہ زیادتیاں کیں کہ حضرت احمد بن حنبلؒ جیسے امام محدث اور نقاد نے بقول بعض عاجز آ کے یہاں تک فرما دیا۔

لم یصح عندی منھا احادیث التفسیر شیٔ

میرے نزدیک ان میں سے کوئی صحیح نہیں ہے۔

امام بخاریؒ تقریباً چھ لاکھ احادیث سے دوچار ہوئے لیکن حذف مکررات کے بعد جن کی تعداد قریب قریب ۳ ہزار ہوگی جس شمار پر اپنی صحت کی مہر ثبت کر سکے وہ کتاب بخاری کی شکل میں سامنے ہے۔ وضاعین تو وضاعین جن کے اس عمل شنیع کے اسباب و علل مختلف تھے۔ کہیں سیاسی اختلافات تھے کہ اموی اپنے مناقب اور عباسیوں کے مثالب میں رطب اللسان رہے کہیں اس کے برخلاف کہیں جبر و اختیار کی تائید اور تردید، کہیں ترغیب و ترہیب کے باب میں اور کہیں تخصیصی فضائل میں تساہل اور مداہنت سے کام لیتے رہے جن سے یک گونہ حرمت و حلت کی سرحدیں مصئون او محفوظ نہ رہ سکیں۔

چنانچہ آیات و سور قرآنیہ کے باب میں ایک ایک کی مخصوص فضیلت بیان کرنے میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ذرا سی بھی جھجک پیدا نہ ہوئی اور تو اور امام بیضاوی جیسے محقق اور دین کے خادم ہر سورت کے ختم پر اس کی مخصوص فضیلت کے بیان سے قلم نہیں روکتے اور علماء امت کی تخریج کے بعد جب ان سے سوال کیا جاتا ہے۔ من این ھذہ الاحادیث یعنی "تم نے یہ حدیثیں کہاں سے لاکے جمع کر دیں" تو جواب میں بقول صاحب شرح مسلم الثبوت جو فرمایا وہ یہ تھا۔

لما رأیت اشتغال الناس بفقہ ابی حنیفۃ و مغازی محمد اسحاق و اعرضوا عن حفظ القرآن وضعت ھذہ الاحادیث حسبۃ للہ تعالیٰ

جب میں نے لوگوں کو دیکھا کہ فقہ حنفی میں اور مغازی محمد اسحاق میں ان کا انہماک ہے اور قرآن کے حفظ سے پہلو تہی کرتے ہیں تو میں نے حسبۃً للہ یہ حدیثیں یہاں لکھ دیں۔ شرح مسلم الثبوت جلد ۲ صفحہ ۱۲۵

بات خواہ سچی اور معقول ہو، رائے صائب اور فکر ہر چند سلیم ہو لیکن لوگوں کے جی میں جب ہی بیٹھتی ہے جب اس کی تائید اور توثیق کتاب و سنت سے کر دی جائے، حکمت اور سمجھ کی باتیں، واعظانہ اور ناصحانہ گفتار اگر تورات انجیل یا ہند او یونان کے اشخاص کی طرف بلا واسطہ منسوب کر کے بیان کی جائیں تو دلوں کی گہرائیوں میں نہیں اترتیں اور شاید یہ امر بھی وضع حدیث کے اہم اسباب میں سے ہوں تو عجب نہیں۔

یہ تو نہ ہوا کہ نیتوں میں فتور اور ارادوں میں قصور ہوتا لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ جھوٹی بات زبان سے دینی شعور کے بغیر نکل گئی یا جھوٹی بات کھری سمجھ کے سامنے لے آئے۔ چنانچہ امام مسلمؒ مقدمۃ الکتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔

عن محمد بن یحییٰ بن سعید القطان عن ابیہ قال لم نر الصالحین فی شیءٍ اکذب منہم فی الحدیث۔

محمد بن یحییٰ بن سعید القطان نے اپنے والد سے سن کے فرمایا کہ ہم نے صلحاء امت کو حدیث سے زائد کذب بیانی کرتے کسی اور چیز پر نہیں پایا۔

لیکن صلحاء امت کے بارے میں یہ بات بڑی ہے چنانچہ امام مسلم نے اس کی توجیہ اور تفسیر یوں کر دی۔

بانہ یجری الکذب علیٰ لسانھم ولا یتعمدون الکذب۔

بلا ارادہ ان کے منہ سے جھوٹی حدیثیں نکل جاتی تھیں

جب بڑوں کا یہ حال ہو تو چھوٹوں کا کہنا کیا۔ چنانچہ بیان کرتے ہیں کہ مہدی ابن منصور کے پاس غیاث ابن ابراہیم ایسے وقت آیا جبکہ وہ کبوتر بازی کے محبوب اور پسندیدہ شغل میں لگا ہوا تھا اس کے شغل کی داد دینے اور اسے خوش کرنے کے لئے فوراً غیاث نے ایک حدیث سنا دی لا سبق الا فی خف او حافر او جناح اس پر مہدی خوش ہو گیا

اور اس نے دس ہزار درہم انعام میں دلا دیئے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا اشھد ان قفاک قفا کذاب علی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا ما قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (جناح) ولکنہ اراد لیتقرب الینا (شرح مسلم الثبوت جلد ۲)

بہرکیف یہ اور اس کے مثل اور بھی گوناگوں اسباب تھے کہ احبار اور صلحاء امت تحمل اور شکیب کو مزید برت نہ پائے اور ان کی دینی رگوں پر ٹیسیں لگیں اور خونوں میں حرارت پیدا ہوئی اور اپنی جانوں کی بازیاں لگا کے قوی کو ضعیف، صحیح کو سقیم اور جید کو ردی سے علیحدہ کرنے کے درپے ہو گئے فجزاھم اللہ احسن الجزاء

کام کی سختی معلوم، عمل کی دشواری ظاہر، لاکھ سوا لاکھ صحابہ کی تعداد اس وقت تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم ناسوت کو چھوڑ کر عالم لاہوت میں تشریف لے گئے، فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا اور صحابہ دور دور بلاد و امصار میں منتشر ہو گئے۔ انھیں میں وہ بھی تھے جنہوں نے اجتماعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ارشادات و فرمائے سنا اور آپ کو عمل کرتے دیکھا اور وہ بھی تھے جنہوں نے انفرادی طور پر بھی کچھ دیکھا اور سنا تھا۔ شروع شروع میں حکومت کی طرف سے تشویق اور تشجیع کے سامان بھی جمع نہ کئے گئے۔ پھر جن صحابہ کے پاس احادیث کی دولت تھی بھی وہ اکثر کتابی شکل میں نہ تھی بلکہ محض حافظہ پر مدار تھا۔ اہل دل نے جرات اور جسارت کی بھی تو صرف ایک حد تک بعد چندے تھک کے بیٹھ گئے۔ وہ صاحب مؤطا ہوں یا اصحاب صحاح ستہ، ابن حبان حاکم، ضیا مقدسی ابن خزیمہ ابن سکن یا ابو عوانہ، احمد بن حنبل، عبدالرزاق، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن مردویہ، طبرانی، دارقطنی، بیہقی یا دیلمی اور ابن عدی وغیرہ وغیرہ جعل اللہ الجنۃ مثواھم۔ کاش! اس دینی کام کے لئے دینی مفرقتیں اور وقتی مصلحتیں مانع نہ ہوئی ہوتیں اور حکومتی معیار پر جمع احادیث کا کام ہوتا جس کی نقول اطراف و اکناف میں بھیجی جاتیں اور بھیجی جایا کرتیں اسی طرح جس طرح کلام پاک کی تدوین کی گئی اور اس کا تحفظ ہوا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

بہرحال صحیح سنن معجم مسند مستخرجات مستدرک اطراف اربعینیات کے عنوانوں سے جمع احادیث کے کام ہوئے اور امت مسلمہ کے مفاخر ملی میں شمار ہوئے اور دور رس نظروں میں اب تک ہوتے ہیں۔

اربعینیات سے مراد چہل حدیث ہیں علماء امت نے جو بھی کچھ اس سلسلہ میں کیا اس کا یہی داعیہ اور جذبہ تھا کہ شرائع محمدیہ اور احکام مصطفویہ کا اک گونہ تحفظ ہو جائے ساتھ ساتھ تبلیغ دین ہو، محدثین اور فقہاء کے زمرہ میں حشر ہو اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شفاعت کا اطمینان۔ چنانچہ شعب الایمان امام بیہقی ابو الدرداء کی روایت کر کے یہ حدیث لاتے ہیں۔

سئل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ما حد العلم الذی اذا بلغہ الرجل کان فقیھا فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من حفظ علی امتی اربعین حدیثا فی امر

دینہا بعثہ اللہ فقیہا وکنت لہ یوم القیامۃ شافعا و شہیدا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے علم کی حد کے متعلق سوال کیا کہ جب کسی کی وہاں تک رسائی ہو جائے تو اسے فقیہ سمجھا جائے تو آپ نے جواباً فرمایا جس نے میری امت میں میری چالیس دین کے متعلق حدیثیں پہنچا دیں تو وہ فقیہ بن کے قیامت میں اٹھے گا اور میں قیامت میں اس کے لئے شفیع اور شاہد بنوں گا۔

اس کے علاوہ ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں

وقیل لہ ادخل من ای ابواب الجنۃ شئت

ان سے کہا جائے گا تمہیں اختیار ہے جنت کے جس دروازے سے چاہو اس میں داخل ہو جاؤ۔

اگرچہ بقول صاحب مشکوٰۃ امام احمد بن حنبل اس کے متعلق فرماتے تھے۔

حدیث متنہ مشہور فیما بین الناس ولیس لہ اسناد صحیح۔

یہ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ کو تو شہرت حاصل ہے لیکن اس کی سندوں میں سے کوئی سند صحیح نہیں۔

اس کے علاوہ حفاظ حدیث کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

انہ حدیث ضعیف وان کثرت طرقہ

یہ ایک ضعیف حدیث ہے اگرچہ کئی سلسلوں سے مروی ہے

امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

طرقہا کلہا ضعیفۃ ولیس بثابۃ

اس حدیث کے تمام سلسلے ضعیف ہی ہیں اور ان میں کوئی ثابت نہیں

تاہم چونکہ علماء امت نے فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عامل ہونے میں کوئی قباحت نہ سمجھی یا لیبلغ الشاہد الغائب کے خیال سے کبار محدثین اور علماء کی ایک غیر محدود جماعت اس عمل خیر کی طرف متوجہ ہو ہی گئی اور کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس راہ میں عبداللہ ابن مبارک کا قدم اٹھا، نسائی، دارقطنی، حاکم بیہقی، ابونعیم وغیرہ نے اربعینیات لکھیں اور تو اور حافظ ابن حجر جو کو من حفظ علی امتی اربعین حدیثا بعثہ یوم القیامۃ فی زمرۃ الفقہاء والعلماء کے اسناد پر قادح تھے مگر اس باب میں پیچھے نہ رہے، حافظ ابن حجر نے دو اربعینہ (چہل حدیث) لکھیں امام نوویؒ کی چہل حدیث بہت پسندیدہ خاطر ہوئی اور بقول صاحب کشف الظنون ابن رجب حنبلی، ابن حجر مکی الشافعی، ملا علی قاری اور دوسرے علماء و محدثین نے

اس کی شروح بھی لکھ دی ہیں۔

اس حدیث میں علماء نے حفظ کے معنی نقل کے لئے ہیں یعنی جو چالیس حدیثیں امت تک پہنچا دے خواہ اپنی یاد سے یا کہیں لکھ کے اور ایک روایت میں بعثہ اللہ فقیہا عالما اور ایک روایت میں فی زمرۃ الشہداء کے لفظ آئے ہیں۔ ایسے جمع بین الروایات کی صورت یہ نکلے گی کہ اربعین حدیث کے نقل کرنے والوں میں بعض وہ ہوں گے جن کا حشر زمرۂ شہداء میں ہوگا بعض وہ جن کا زمرہ علماء میں اور بعض فقہا اور علماء دونوں کے زمرہ میں محشور ہوں گے۔ اگرچہ دنیوی زندگی میں ان اوصاف کے یہ حامل نہ تھے۔

بہرکیف فضائل اعمال کے باب میں ضعیف حدیث پر عمل کے جواز میں علماء امت کا اتفاق یا فلیبلغ الشاہد منکم الغائب جیسی صحیح حدیث پر یا حدیث نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاھا فاداھا کما سمعھا پر اتحاد یہی وہ دواعی تھے جن کے پیش نظر علماء و محدثین کی ایک خاص جماعت نے جمع آوری کی طرف توجہ فرمائی۔

ان حضرات کے نقاط نظر مختلف رہے بعض نے صرف اصول دینی الہیات نبوات حشر نشر کی حدیثیں جمع کیں، بعض نے فروع اور مسائل فقہیہ کی، بعض نے جہاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اوقات کے خطبے، بعضوں نے زہد خصائل محمودہ اور مکارم اخلاق اور بعضوں نے ان سب کو شامل کر کے چہل حدیث کے مجموعے مرتب کئے۔

بعضوں نے بخاری اور مسلم کی روایت کردہ چالیس احادیث لیں چنانچہ امام نووی نے اپنی چہل حدیث کے مقدمہ میں لکھا ہے وقد رأیت جمع اربعین اھم من ھذا کلہ وھی اربعون حدیثا مشتملۃ علی جمیع ذلک و کل حدیث منھا قاعدۃ عظیمۃ من قواعد الدین قد وصفہ العلماء بان مدار الدین علیہ او ھو نصف الاسلام او ثلثۃ او نحو ذلک۔

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:-

وینبغی لکل راغب فی الآخرۃ ان یعرف ھذہ الاحادیث

لما اشتملت علیہ من المھمات واحتوت علیہ من التنبیہ

علی جمیع الطاعات۔

جس کو اپنی آخرت سنوارنے کی خواہش ہو اسے چاہیئے کہ وہ ان احادیث سے دوچار رہے

اس لئے کہ ان میں عقائد دینیہ، شرائع الہیہ کے اصول اور طاعات ضروریہ پر متنبہ کیا گیا ہے۔

حدیث میں اربعین سے حصر مقصود نہیں ہے بلکہ اگر اس سے زائد جمع کر دی جائیں تو خیر و فلاح سے خالی نہیں۔ من زاد اللہ فی حسناتہ۔

(ماہنامہ تذکرہ۔ دیوبند۔ بابت دسمبر ۶۲ء)